تشنگی کا سفر

کنیز نبوی

کنیز نبوی

تشنگی کا سفر

"تنہا عورت بہت آسان ہدف ہوتی ہے۔ اور بہت غیر محفوظ بھی۔" اماں حسب معمول شروع تھیں۔ اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"اب چھوڑ بھی دے مریم! دیکھ نہیں رہی کہ بچی کتنی تھک کے آئی ہے۔" نانی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"اماں! تب ہی تو کہتی ہوں چھوڑ دے کیا فائدہ ایسی نوکری کا گدھوں کی طرح سارا دن جتے رہنا۔ اب دیکھو' روز بدین آنا جانا کتنا لمبا راستہ ہے۔"

"اماں! آپ مجھے وہاں رہنے بھی تو نہیں دیتیں نا!" اس نے تھکے تھکے لہجے میں شکوہ کیا۔

"ہاں تو کیسے رہنے دوں میں تمہیں' وہاں اکیلے۔ جوان جہاں لڑکی ہے۔"

"تو پھر آپ چل کر میرے ساتھ رہیں نا!"

"نہیں۔ میں نہیں جاسکتی۔ تمہیں پتا تو ہے نا پھر بار بار اصرار کیوں کرتی ہو۔"

"اماں! آپ کی بھی نا وفاداری کی حد ہے۔ بیٹی اتنی پریشان ہے روز اتنا لمبا سفر کرنا پڑتا ہے اور آپ وکیل صاحب کی بیگم کو نہیں چھوڑ سکتیں۔" وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھی۔

"ماروی! ایسا مت کہو' وہ ہمارے برے دِنوں کی

مکمل ناول



ساتھی ہیں، ہماری رگوں میں ان کا دیا ہوا رزق دوڑ رہا ہے، اب ان کو اس برے حال میں کیسے چھوڑ دوں؟ بولو۔"

"مگر اماں! بیگم صاحبہ کی بیماری تو ساری عمر چلی ہے۔ کیا آپ ساری عمر ان ہی کی خدمت کرتی رہیں گی۔" اس نے چڑ کر تکیہ گود میں رکھا۔

"ماروی! میں دیکھ رہی ہوں کہ تو بہت اونچا اڑنے لگی ہے، چار پیسے کیا کمانے لگی، اپنی اوقات ہی بھول گئی۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کے اٹھ گئی، اماں کبھی نہیں بدلے گی۔

"ارے مریم! ماروی کو کارڈ تو دکھاؤ۔" نانی کے کہنے پر وہ واش روم میں جاتے جاتے رک گئی۔

"ڈاکٹر زین العابدین شاہ، یہ کون ہیں؟" اس نے انویٹیشن کارڈ انگلیوں میں پکڑ کر ہوا میں لہرایا۔

"بیٹا! یہ بی بی آمنہ کا بیٹا ہے۔"

"اور بی بی آمنہ کون ہیں؟" اس نے یاد نہ آنے پر استفسار کیا۔

"بیٹا! ٹھیاری کے سید ہیں نا!"

"نانی! ٹھیاری تو ساری سیدوں سے بھری ہوئی ہے، بلکہ سندھ میں زیادہ تر سید پھیلے ہی سرزمین ٹھیاری سے ہیں۔ اب مجھے کیا پتا کہ بی بی آمنہ کون ہیں؟"

"ارے بیٹا! تمہاری ماں کی بڑی ہمدرد سہیلی تھی۔ جب مرتضیٰ نے تیری ماں کو طلاق دی تو بی بی آمنہ نے ہی سہارا دیا تھا۔"

"کیوں نانی! اماں آپ کے پاس نہیں آئی تھیں؟" اس نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

"کچھ عرصے کے بعد آئی تھی، پہلے وہاں بی بی آمنہ کے پاس رہی، تم چھوٹی تھیں تب۔"

"کتنا عرصہ وہ وہاں رہیں؟" وہ واپس آ کر نانی کے پاس بیٹھ گئی۔

"کوئی ایک سال رہی ہوگی۔ ہے نا مریم!" نانی نے تصدیق چاہی، وہ خاموش رہیں، اور بستروں پر چادریں بچھانے لگیں، اس نے ماں کے خاموش چہرے کو دیکھا، پھر نانی کو۔

"مگر نانی! اماں اتنا عرصہ وہاں کیوں رہیں؟" اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

"ارے لڑکی! تم تو جڑ سے پتے نکالنے بیٹھ جاتی ہو، جاؤ منہ ہاتھ دھو آؤ تو کھانا کھائیں۔" مریم نے چڑ کر کہا۔

"اماں! آپ ہمیشہ ایسا کرتی ہیں، آخر بتاتی کیوں نہیں مجھے کہ آپ کے ساتھ ہوا کیا تھا۔" وہ جھنجلا گئی۔

"جاؤ بیٹا! تھک کے آئی ہو، نہا لو تو کھانا کھائیں۔" نانی نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"آخر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جس شخص کو میرا باپ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ کون تھا اور اس نے میری ماں کو کس جرم کی پاداش میں چھوڑ دیا۔ اس نے میری ماں کو طلاق دے دی۔ کیونکہ وہ بے وفا تھا۔ ہرجائی تھا اور اس نے میری ماں سے وفا کی، دھوکہ دیا۔ یہ سب تو بچپن سے سنتی آئی ہوں اور اماں کی زندگی کی کتاب آگے خالی۔ اس کے ہر صفحے پر اب صرف میں ہوں، یا کبھی کبھار کوئی طعنہ کوئی کوسنا اس بے وفا کے نام جس نے بیچ سفر میں ان کی گود میں بچی دے کر تنہا کر دیا تھا۔"

"بیٹا! اٹھ جاؤ۔ کیا سوچ رہی ہو؟" نانی کے کہنے پر وہ اک ٹھنڈی سانس بھر کے تھکے تھکے قدموں سے اٹھ گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

شاہ لطیف کی دھرتی پر یہ اس کی پہلی صبح تھی۔ دس سال کے طویل عرصے بعد پہلی صبح، دس سال پہلے اس دھرتی پر اس کی جو آخری صبح تھی، وہ بہت غمگین تھی۔

اس کے باپ کو فوت ہوئے ساڑھے چار ماہ ہوئے تھے، اس کی ماں کی عدت چند دن پہلے ختم ہوئی تھی، بہت ساری ذمے داریوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ آبائی زمین باپ نے ساری عمر بیچ کے کھائی۔ اس سے محنت نہیں ہوتی تھی۔ ساری عمر دوستوں کے

پیچھے گھومتے اور شکار کرتے گزار دی، یہ بھی نہ سوچا کہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے لیے کچھ چھوڑ دے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا۔ ایک سال پہلے جب اس نے باغ والی زرعی زمین بیچی تو اس کی ماں نے کتنی منتیں کی تھیں کہ یہ زمین بیٹوں کے لیے چھوڑ دے، مگر ان کا جواب ایک ہی تھا۔ "یہ میرا نصیب تھا جو میں کھا رہا ہوں۔ جو ان کا نصیب ہوگا وہ ان کو مل جائے گا۔"

ان کی ماں کے تقاضے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس زمین کے پیسوں میں سے دادا کے دور کی بنی حویلی کے ساتھ چار کمروں کا ایک جدید پورشن بن گیا، جب اس کی وفات ہوئی تو ان کی ڈھائی سو ایکڑ آبائی زمین میں سے صرف بیس ایکڑ بچی تھی۔ اور وہ بھی سیم و تھور والی۔

باپ کے فوت ہونے کے بعد جب اس نے جا کر زمین دیکھی، خرچے کا اندازہ لگایا تو بات اس کے بس سے باہر تھی۔ اس زمین پر تین سال تک سرمایہ لگانے کی ضرورت تھی۔ پھر کہیں جا کر زمین سے کچھ پیداوار لانے کی امید بندھتی، اور اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ تین سال تک کلر والی زمین پر لگاتا۔ زین العابدین ابھی فرسٹ ایئر میں تھا اور اس نے اسی سال سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کی ڈگری لی تھی، تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ ابھی ملازمت کی تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس کے باپ مہر علی شاہ کی وفات ہوئی، گھر میں رکھے ہوئے پیسے ان کے سوئم، چہلم اور گھر کے خرچوں کی نذر ہو گئے تھے۔

بڑی بہن کی چند دن پہلے ہی شادی ہوئی تھی جبکہ چھوٹی ابھی [illegible] میں تھی۔ تب ہی اسے سعودی عرب جانے کا موقع مل گیا، ٹھیاری کا اک میمن سعودیہ عرب میں ملازمت چھوڑ کر آنے لگا، تو اس کے کفیل نے اپنی جگہ کسی ایمان دار آدمی کو بھیجنے کو کہا تھا جو اس کے طائف کے باغات اور حساب کتاب سنبھالے۔ اس کی ماں نے اپنی ازلی محبت سے اسے روکنے کی کوشش کی، مگر یہاں حالات غیر یقینی تھے، پتا نہیں کوئی ملازمت ملے یا نہیں، اس لیے یہ موقع وہ گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

اور تب اس اداس غمگین صبح کو وہ گھر والوں کو الوداع کہہ کر لطیف کی نگری سے رزق کی تلاش میں نکلا تھا، پچھلے دس سالوں میں وہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا، ہر سال ماں کے ساتھ کبھی بھائی کبھی کسی بہن کو عمرے کے لیے بلوا لیتا، وہ کہتا "اماں آپ آ جائیں، اچھا ہے عمرہ بھی ہو جائے گا۔" اس عرصے میں اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہو چکی تھی، اور زین العابدین ڈاکٹر بن چکا تھا، بہن کی شادی میں وہ شرکت نہ کر سکا، مگر بھائی کی شادی میں اسے آنا ہی پڑا کہ یہ زین کی شرط تھی، یہ ذمہ داری پوری کر کے وہ ہر ذمہ داری سے فارغ ہو جاتا۔ ان دس سالوں میں وہ اپنی محنت سے بہت مطمئن تھا۔ ہر ماہ گھر بھجوانے کے بعد بھی وہ اچھا خاصا بچا لیتا تھا۔ اب کا وہیں مستقل رہنے کا ارادہ تھا، ان کی مالی پوزیشن کافی مستحکم ہو چکی تھی، ان کی زرعی زمین بھی اب آباد تھی۔ اس سے آنے والی آمدنی اور پس انداز کی ہوئی رقم اس نے زین کو بھیج کر مشورہ دیا کہ اس سے اور زمین خرید لو۔

اور رات جب سب اس کو جناح ٹرمینل پر ریسیو کرنے آئے تھے تو ان سب کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، ٹھیاری کے طویل راستے میں وہ بہنوں اور بھائی کے ساتھ مسلسل بولتا رہا تھا، ٹھیاری پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ اس لیے اس کی دوسرے رشتے داروں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

حسب معمول صبح وہ جلد اٹھ گیا، ابھی صرف اس کی ماں اٹھی تھی، جو پرانی حویلی کے برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی، اس کا کمرہ ماما اظہار نبی کے گھر کی چار دیواری سے لگا ہوا تھا، اظہار نبی اس کی ماں کا سگا بھائی تھا، دیوار کی دوسری طرف لگے ہوئے آم کے پیڑ کی ایک لمبی شاخ دیوار پھلانگ کر ان کے صحن میں چھاؤں پھیلائی تھی، آموں پر بور آ چکا تھا اور صبح کی ٹھنڈی ہوا اس بور کو شاخوں سے چھین کر دور تک پھیلا رہی تھی۔

اس شاہ لطیف کی نگری کی صبح نے اس کو پچھلے دس

سال یاد دلا دیے تھے۔
وہ اس فضا میں سانس لینے لگا جس میں شاہ لطیف کی وائی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔
اس وقت اس کے دل نے چاہا کہ وہ اڑ کر ہالا پہنچ جائے اور شاہ کے روضے میں بیٹھ کر فقیروں کا کلام سنے۔ ”اس وقت شاہ سائیں بھٹائی سرکار کا کون سا سُر سننا مناسب ہوگا۔“
”یقیناً ایمن کلیان!“ وہ سوچ کر مسکرایا اور اس کے دل میں شاہ لطیف کی محبت کے پھول کھلنے لگے‘ خوشبو دینے لگے‘ وہ اس خوشبو میں کھویا ہوا تھا کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا‘ وہ اس کیفیت سے نکل آیا۔
” تو جناب شاہ سائیں نے کہا۔
ڈوریاں ڈوریاں ‘ ملھاں ‘ شالا مہ ملاں ہوت من اندر جالوچ ‘ پچھن سال ما تھی تھیے۔
میں محبوب کو ہمیشہ ڈھونڈتی رہوں ‘ خدا کرے مجھے محبوب نہ ملے میں اسے دیکھ نہ پاؤں ‘ حاصل نہ کر پاؤں ‘ کہیں بعد از وصل وہ تڑپ و بے قراری ماند نہ پڑ جائے ‘ خاموش ‘ ختم ہی نہ ہو جائے۔“
آواز اور پڑھنے کا انداز بہت خوب صورت تھا ‘ شاہ کا بیت مکمل سبھاؤ اور صحیح تلفظ سے کوئی کوئی ہی پڑھ سکتا ہے ‘ ورنہ اکثر لوگ اعراب میں غلطیاں کر جاتے ہیں ‘ اور جو آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی تھی ‘ اس نے بیت کو پوری قابلیت سے سماعتوں تک پہنچایا تھا ‘ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دیوار کے پیچھے سے آتی ہوئی اس آواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔
اب وہ مکمل تفصیل سے اس بیت کا پس منظر سنا رہی تھی۔
” جب شاہ سائیں حج کرنے کے شوق میں پیدل چلے اور تھک کر کہیں چشمے کے پاس بیٹھ گئے ‘ دیکھا کہ پانی کی تلاش میں پیاس سے بے حال بکریاں دوڑتی آ رہی تھیں ‘ آکر اسی چشمے سے پانی پیا ‘ جب سیراب ہو گئیں تو اس چشمے میں پیشاب کر کے گندگی پھیلانے لگیں تو شاہ نے یہ بیت کہا اور واپس لوٹ آئے۔
تو جناب شاہ سائیں نے کہا ‘ ملنے کے بعد تڑپ ختم ہو جاتی ہے ‘ جو مزہ اس دوری کی تڑپ میں ہے ‘ وہ وصال میں کہاں ہے؟“
وہ آواز بہت خوب صورت تھی ‘ اور اس کا لہجہ بہت دل نشیں ‘ اس نے زندگی میں بہت ساری آوازیں سنی تھیں ‘ مگر اس لمحہ موجود میں وہ خود معترف تھا کہ ایسی دل نشیں اور کھینچنے والی آواز اس نے اپنی عمر کے تینتس برسوں میں نہیں سنی تھی ‘ وہ مقناطیسی آواز اس کو دیوار کے پیچھے سے کھینچ رہی تھی ‘ وہ کھڑکی کے قریب پہنچا ‘ یہ ماما اظہار نبی کا گھر تھا اور ماما اظہار نبی کے گھر کے سارے افراد سے وہ اچھی طرح واقف تھا ‘ ان کی دونوں بیویاں ‘ بڑی جیجی اور ماما اظہار کے بڑے بیٹے انوار نبی کی بیوی کو بھی دیکھ اور سن چکا تھا ‘ جو ایک سال پہلے عمرے کی غرض سے آئے تو اس کے پاس بھی چند دن ٹھہرے تھے۔
پھر یہ آواز کس کی تھی؟ کافی سوچنے کے بعد بھی کوئی نام اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا ‘ کیا یہ لڑکی کوئی مہمان ہے جو ان کے ہاں آئی ہے۔
اس کا دل مچلا تھا کہ وہ کھڑکی کھول کے اس کو دیکھ لے ‘ جس کی آواز میں اسے اک طلسم سا محسوس ہو رہا تھا ‘ دس سال دوری کا حجاب تھا جو اسے روک رہا تھا ‘ ورنہ یہی کھڑکی وہ آنے جانے کے لیے استعمال کرتے تھے ‘ اس نے سر جھٹک کر کھڑکی کی کنڈی پر ہاتھ رکھا۔
یہ غیر اخلاقی حرکت تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے نگاہ چاروں طرف دوڑائی۔
پرانی حویلی کے لمبے برآمدے میں نماز فجر پڑھ کر تخت پر تسبیح پڑھتی ہوئی۔ ماں پر اس کی نظر ٹک گئی۔ اس کا ہاتھ کنڈی سے گر گیا ‘ اس کا سارا وجود شرمندگی میں گھر گیا۔
اس شرمندگی کے احساس نے اس طلسمی آواز کی زنجیر سے اس کے پاؤں آزاد کر دیے تھے ‘ وہ ماں کی طرف بڑھ گیا۔
وہ اس کی ماں تھی ‘ اور مائیں بہت سارے جادو اور سحر سے اولاد کو بچا لیتی ہیں۔ وہ ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا اور بی بی آمنہ کا تسبیح والا ہاتھ اس کے سر کے گھنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔
”تمہیں پتا ہے نور العارفین! یہ دس سال میں نے تمہیں اس آنگن میں ڈھونڈتے گزارے ہیں۔“
اس کی ماں کی آواز میں دس سال کی دوری کا دکھ کروٹیں لے رہا تھا۔ اس وقت وہ اس طلسمی آواز کو بھول گیا ‘ اس کے ہاتھ مضبوطی سے ماں کے گھٹنے پر جم گئے۔
”ماں! اب تو میں آ گیا ہوں نا!“ اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا ‘ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کی بھی آنکھیں بھیگ گئیں ‘ اس وقت اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ ان سالوں میں اس نے وطن نہ آکر شدید غلطی کی ہے۔
”دیکھو بیٹا! تم نے ان ذمے داریوں کو نبھاتے بہت وقت گزار دیا۔ اب اپنی زندگی کو دیکھو ‘ زین کی شادی سے پہلے تمہاری شادی ہونا چاہیے تھی مگر تم نہیں ملے۔ اب شادی کی تقریب میں خاندان کی بہت ساری لڑکیاں آئیں گی۔ تم ان کو دیکھ لو ‘ جو پسند آئے بتا دینا۔“
اس نے مسکرا کر ماں کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
”جو حکم میری ماں کا۔ سر آنکھوں پر۔“ اس نے بی بی آمنہ کے ہاتھ پر اپنے لب رکھ دیے۔



جھگڑے کا آغاز ہمیشہ چھوٹی سی بات سے ہوتا ہے ‘ پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور ملکیت کا احساس ‘ اقتدار کی خواہش تو ہمیشہ سے فساد کا سبب رہی ہے باہر سے جھگڑے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
”تو ہے ڈائن ‘ ناگن ‘ میرا گھر برباد کرنے والی۔“ اس کی ماں کی آواز میں دکھ نمایاں تھا۔
”اتنی ہی گنوں والی ہوتی تو باندھ کے رکھتی شوہر کو۔“ یہ آواز اس کے باپ کی دوسری بیوی کی تھی۔
اس نے دونوں کانوں پہ تکیہ رکھ لیا۔ انسان ساری غلطیاں کرنے کے بعد خود کو مظلوم کیوں سمجھتا ہے۔
شاید یہ احساس تب پیدا ہو جب وہ جنت سے نکالا گیا تھا۔
”نہیں۔“ دوسرے لمحے ہی اس نے اپنی سوچ کو سختی سے رد کر دیا۔
انسان نے تو خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔
انسان مظلوم تب بنا جب دوسرے انسان نے اس کا استحصال کیا ‘ اس کے حق پر ڈاکہ ڈالا۔
باہر سے شور کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں ‘ اس جھگڑے کا اختتام کب ہوگا ‘ آخر کب تک ایک عورت دوسری عورت سے مرد کی ذات کے لیے لڑتی رہے گی ‘ اس نے جھنجلا کر اخبار اٹھایا۔
سات بچوں کی ماں آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔

شوہر نے بیوی کو کاری کر کے قتل کر دیا۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں تین افراد جاں بحق۔ ایک قبیلے کے پانچ آدمیوں نے دوسرے قبیلے کے دو افراد کو قتل کر دیا۔ دونوں قبیلے مورچہ بند۔

کراچی میں لینڈ مافیا نے زمین پر قبضہ کر لیا۔

پانی نہ ملنے پر احتجاجی مظاہرہ۔

اس نے غصے سے اخبار رول کر کے پھینک دیا' توجہ کیا بختی یہاں تو اور بندہ یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے' یہ سب کیا ہو رہا ہے' کہیں بھی سکون نہیں' اس نے اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل کی دراز سے ڈائری نکالی' کیا لکھوں' ذہن بالکل صاف و شفاف سلیٹ کی طرح تھا' کوئی اقتباس' کوئی شعر' کوئی بات اسے یاد نہیں آ رہی تھی' اس نے بے دلی سے ڈائری واپس رکھی۔ چیئر کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

دل میں اک عجیب سکوت تھا' کوئی احساس' کوئی جذبہ ابھر کے سامنے نہیں آ رہا تھا' اک عدد منگیتر رکھنے کے باوجود۔ وہ تلخی سے مسکرائی۔

"آخر میرا دل اس کی طرف مائل کیوں نہیں ہوا؟" وہ سنجیدگی سے وجوہات پر غور کرنے لگی۔ "اس کی تعلیم میں عدم دلچسپی اور بے ڈھنگے پن سے چلنا اور بات کرنا یا لوفروں کے سے اطوار' مجھے پسند نہیں' یا مرغیاں اور کبوتر پالنا۔"

شاید یہی وجوہات ہیں اس کو ناپسند کرنے کی۔

"میں یقیناً اس کے ساتھ خوش نہیں رہ پاؤں گی۔"

وہ سوچ کے پھر یاسیت کا شکار ہوئی۔

"جو ہوگا نصیب میں ہوگا دیکھا جائے گا' ابھی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے سوچ کر سر جھٹکا۔

باہر جنگ کے بعد اب پر امن ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں' وہ دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گئی' لکڑی کی منقش کھڑکیوں اور جالیوں والا پرانی طرز کا بنا ہوا برآمدہ اسے شروع سے ہی اچھا لگتا تھا' اس نے اپنا کمرہ بھی اس برآمدے کے بیچ والا لیا تھا' سائیڈ پر جیجی کا کمرہ تھا' دوسری سائیڈ پہ اس کی بھابی اور ماں کے کمرے تھے' اس کی بائیں سائیڈ پر جدید طرز کے تین کمرے تھے' جو کہ وہ اس کے باپ کی دوسری بیوی اور تیسرا ڈرائنگ روم کے لیے استعمال ہوتا تھا' جیجی کے کمرے کے سامنے ہی لمبے برآمدے میں ان کا تخت پڑا ہوا تھا' جیجی کی اس کی طرف پشت تھی' وہ ان کے تخت پر ان کے سامنے آکر لیٹ گئی' وہ اسے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں۔

تسبیح کے دانے تیزی سے نیچے گر رہے تھے' اس کی نظریں جم گئیں۔ "جیجی اتنی عبادت کیوں کرتی ہیں؟"

"ہاں! نکل آئی باہر۔"

جیجی نے تسبیح ختم کر کے اس پر دم کیا۔ ان کے گلابی لب مسکرا رہے تھے' چشمے کے پیچھے سے ان کی روشن چمک دار آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں' سندھ کے اندر یہ کیسی روایت ہے کہ بیٹی کو ماں اور بیٹے کو بابا کہا جاتا ہے۔ یہ بھی پیار کا انداز ہے' اولاد کو ماں باپ کی طرح عزت دینے کا طریقہ' اس نے سوچا۔ شاید سندھ کے لوگوں میں سادگی اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

"جیجی جان! ہمارے گھر سے یہ دنگا فساد آخر کب دور ہوگا؟"

"ماں! کیوں پریشان ہوتی ہو' یہ جھگڑا تو نبیوں کی بیویوں کے درمیان بھی رہا ہے' بی بی سارہ' بی بی ہاجرہ کو بھول گئیں کیا؟"

"مگر جیجی! نور العارفین اتنے سالوں کے بعد آیا ہے۔ کیا سوچے گا' اتنا جھگڑا؟ کچھ خیال کرنا چاہیے تھا نا' دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے' ساری آواز دوسری طرف جاتی ہے۔" وہ جھنجلائی۔

"تو نور العارفین کون سا غیر ہے۔ اسے سب پتا ہے کہ اس گھر میں اس کی دو مامیاں ایک ساتھ رہتی ہیں' سو ایسے جھگڑے چلتے رہتے ہیں' تم پریشان مت ہوا کرو' جاؤ اپنی ماں سے کہو کہ اتنے سال بعد میرا بھانجا آیا ہے' جا کر اس سے مل کے آئے' میں تو چل کر نہیں جا سکتی۔"

"السلام علیکم جیجی!"

اس مردانہ آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور جلدی سے دوپٹہ درست کیا۔

"ماں سے پوچھا۔ جیجی کیسی ہیں تو اس نے کہا کہ اب چل پھر نہیں سکتیں۔ کمرے سے برآمدے تک محدود ہو گئی ہیں' تو میں نے کہا کہ میں خود چل کر آپ سے مل آتا ہوں۔" اس نے جیجی کا ہاتھ چوم کر بتایا۔

جیجی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر دعائیں دیں۔

"بہن کو کہا کہ جا کر جیجی کو بتا آؤ' میں ملنے آ رہا ہوں تو اس نے کہا۔ بتا دیا ہے۔" اس نے اپنے اچانک آنے کی وضاحت کی۔

"السلام علیکم لوا!" اس نے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

اس نے کنفیوژ سی کھڑی اس لڑکی کو دیکھا۔ یہ آواز صبح والی ہی تھی' مگر یہ تھی کون' اس نے سلام کا جواب دے کر سوالیہ نظروں سے جیجی کو دیکھا۔

"یہ اعجاز کی بیٹی ہے سندھیا۔"

"ارے اتنی بڑی ہو گئی' میں گیا تو یہ ساتویں میں تھی۔" اس نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

"تو تم کون سا دو ماہ کے بعد آئے ہو۔" اماں نے آتے ہوئے ہنس کے کہا' وہ ان سے ملنے لگا' تو اس نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اپنے کمرے میں آکر دم لیا' "مجھے اتنا کنفیوز ہونے کی کیا ضرورت تھی۔" اسے خود پر غصہ آیا۔

"ویسے بندہ شاندار ہے۔" اس نے لاشعوری طور پر اعتراف کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اماں! اعجاز نبی کی بیٹی سندھیا" وہ دو چوٹیاں بنائے ہوئے اسکول جانے والی دبلی پتلی لڑکی۔" وہ اس کے بوکھلائے ہوئے روپ کو خیال میں بھر کے مسکرایا۔

"شاید یہ پہلی لڑکی ہے' جس کو دیکھ کر سوچا ہے کہ میری شریک حیات ایسی ہو۔"

"ایسی کیوں؟ یہ ہی کیوں نہیں؟" دل نے ہمک کر کہا۔

"پورے گیارہ سال چھوٹی ہے مجھ سے' کیا وہ لوگ اس کے گھر والے مان جائیں گے؟"

"نور العارفین!" باہر سے شنزین کی آواز پر وہ چونکا۔

"جی آپا!" وہ سرعت سے کمرے سے باہر نکلا۔

"نور! تم چلو ہمارے ساتھ حیدر آباد' ابھی جیولر کا فون آیا تھا کہ جیولری تیار ہے' کچھ اور بھی شاپنگ کرنی ہے۔"

"چلیں میں تیار ہوں۔" اس نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

"شکر ہے لوا! آپ اتنی آسانی سے مان گئے' ورنہ زین تو اتنی منتیں کرواتا ہے کہ بس۔" وہ شنزین کی بات پر مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

آپا کے ساتھ سندھیا کو آتے دیکھ کر اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

وہ اسے سننا چاہتا تھا' اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ اس وقت بھی خاموش بیٹھی تھی' اس کی جھجک وہ صاف محسوس کر رہا تھا۔ آپا اور شنزین کی باتوں کا صرف ہوں' ہاں میں جواب دیتی ہوئی' اس کے دل پر دستک دے رہی تھی۔

"کیا یہ محبت ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ پتا نہیں مگر دل اس کی موجودگی سے مسرور ضرور تھا۔

سارے راستے وہ خاموش رہی' جیولر کے ہاں بھی بمشکل لائبہ سے کاٹن کے سوٹ لیتے ہوئے۔ وہ ٹیلر کو دیتے ہوئے' آپا اور شنزین کی طرح اس نے کوئی ہدایات نہیں دیں' وہ اچھی خاصی کنفیوز تھی۔ چوڑیوں کی دکان پر اس نے چوڑیوں کے ایک سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس سے پہلے نور العارفین نے وہ سیٹ اٹھا لیا۔

اس نے حیرت سے نور العارفین کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں اور لب مسکرا رہے تھے۔

"سنا ہے حیدر آباد کی چوڑیاں بڑی مشہور ہیں۔"

اس نے اب بھی صرف سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

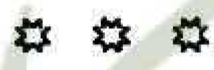
"یہ اور مشہور ہو جائیں گی اگر آپ پہنیں گی۔"
"جی نہیں۔ میں ماڈل نہیں ہوں۔"
وہ اس کے جواب پر بے حد محظوظ ہوا "یہ چوڑیاں اور خوب صورت لگیں گی اگر آپ پہنیں گی اب تو ٹھیک ہے نا!" وہ اس کی بات پر چپ رہ گئی۔
"ارے آپا! دیکھیں۔ میں سندھیا کو چوڑیاں لے کر دے رہا ہوں، مگر یہ لے نہیں رہی۔" اس نے بہنوں کو آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
"سندھیا! تم نے کچھ لینا بھی ہے۔ وہاں کپڑوں سے بھی انکار کر دیا۔ اب اماں کی ڈانٹ بھی خود کھانا، ہمیں کہیں گی کہ میری بھتیجی کا خیال نہیں رکھا۔" آپا کہتے ہوئے دوسری جانب متوجہ ہو گئیں۔
"ہاں بالکل، یہ لو۔" اس نے بہت سارے سیٹ ہاتھوں میں اٹھا کر دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیے۔ اس نے چوڑیاں اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے اس نے اس بار نور العارفین کو گھور کر دیکھا۔
"اک شرارت کرتے ہیں"
مدھم ہنسی کے ساتھ آواز آئی اس نے سر جھکایا، نور العارفین نے چوڑیوں کے سارے سیٹ شاپر میں ڈالے اور سندھیا کا ہاتھ پکڑ کر شاپر اسے تھمایا۔
"آؤ محبت کرتے ہیں"
سرگوشی اس کے کان کے قریب ابھری، وہ بے تحاشا نروس ہو گئی، پسینے کے ننھے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار ہوئے تھے، سر اٹھا کر نور العارفین کو دیکھنا اب اس کے لیے ناممکن ہو گیا تھا، وہ بھاگنے کے لیے مڑی، مگر وہ ہاتھ باندھے اس کے سامنے آگیا۔
"آؤ محبت کرتے ہیں"
"اب چلو بھی۔" آپا کی آواز پر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔



آؤ اوریاں جھل توں، چھڈ لیمپان بچار
شرک سال ستار، کھنا کھارم ڈھوا

(میں نے منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے اپنی خودی کو ترک کیا، اے عیب چھپانے والے خدا! میں نے شرک کے ساتھ بڑی عمر گزاری ہے۔)
وہ آکر جیجی کے تخت پر لیٹ گئی تھی انوار نبی بھی جیجی کے پاس بیٹھا تھا، جیجی اب اس بیت کی تشریح کر رہی تھیں۔
"بندہ جب تک اپنی "میں" کو ختم نہیں کرے گا تب تک منزل نہیں ملتی بیٹا! اپنے نفس کی بات ماننا بھی شرک ہے، اسی بات کا شاہ سائیں عبداللطیف بھٹائی نے درس دیا ہے۔"
"جیجی! یہ بالکل درست بات ہے کہ بندے کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہی ہے، جو شیطان کے بہکاوے میں آسانی سے آجاتا ہے۔"
انوار نبی کہتے ہوئے اٹھا۔
"سندھیا! میں حیدر آباد جا رہا ہوں، تمہیں کچھ چاہیے تو بتا دو۔"
اس نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔ "نہیں اڈا! کچھ بھی نہیں۔"
"اچھا جیجی! دعا کرنا۔"
"آبا! اللہ پناہ میں رکھے تمہیں۔"
وہ گم صم سی آنکھیں موندے پڑی تھی، نور العارفین کے اظہارِ محبت نے اس کے دل پر پہلی ہی دستک دی تھی، اور اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کے دل کے پٹ کیسے وا ہو گئے۔ وہ کئی دن سے پریشان تھی، اس کے ساتھ یہ کیا ہو رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت نے اسے گم صم اور پریشان کر دیا تھا۔
جیجی اسے کتنی ہی دیر بغور دیکھتی رہیں، کئی دن سے اس کی موجودگی اور ناموجودگی برابر تھی، وہ جہاں بیٹھتی اپنی سوچوں میں کھوئی رہتی۔
"اماں۔۔ سندھیا!" جیجی نے پکارا۔
مگر اس پکار کا جواب نہیں آیا، جیجی نے اس کی نیم وا آنکھوں کے خمار کو دیکھا اور سوچ میں پڑ گئیں۔
مے اور محبت دونوں ہی آنکھوں کو خمار زدہ کر دیتے ہیں اس کی آنکھوں پہ کیسا خمار تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئیں کہ اس کی نوخیز بھتیجی کس راہ پر چل نکلی ہے۔
"سندھیا۔۔! کیا بات ہے طبیعت صحیح ہے؟"
"جی؟" اس نے آنکھیں کھول کر انہیں غائب دماغی سے دیکھا۔ "جیجی! آپ نے کچھ کہا؟"
مسکرا دیں۔ "ہاں۔۔!"
اکھیوں سے لئی دھار، جن سیں پسیں پریں کھے
بیٹھے ذاتہ کیم نہار گھنور سارا سریں
(آنکھیں وہی رکھو، جن سے محبوب "حقیقی" کا دیدار کر سکو، کسی دوسرے کی طرف مت دیکھنا کیونکہ محبوبِ "حقیقی" بے حد غیرت مند ہے۔)
اس کا ذہن ایک دم بیدار ہوا تھا، اس نے بے اختیار جیجی سے نظریں چرائیں، ورنہ عام طور پر وہ جیجی کے پڑھے ہوئے بیت کے معنی جیجی سے پوچھتی پھر خود تشریح کرنے لگتی۔
"کیا جیجی میرے احساسات جان گئی ہیں؟" اس نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں، جیجی نے بغور اسے دیکھا اور گہری سانس لے کر پھر سے تسبیح کرنے لگیں۔



بچپن سے لے کر جوانی تک ماروی نے اپنی ماں کی زبانی عشق اور مرد کو کوستے پایا، نفرت کرتے دیکھا اس نامراد عشق نے اس کی ماں کو بے گھر کر دیا تھا۔ بچپن سے عشق کا ذکر سنتے سنتے اسے اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ اسے ہر آنکھ اپنی استعداد عشق بتاتی تھی۔
وہ آنکھ کا طلسم جان گئی تھی اسی لیے اس سے کوئی آنکھ اپنے اسرار چھپاتی ہی نہیں تھی۔
بڑی جیجی کی آنکھ کا عشق نابد تھا اعجاز نبی شاہ کی پہلی بی بی کی آنکھ ابھی تک کرلا رہی تھی، دوسری بی بی کی آنکھ کا عشق اب ماٹھا تھا اور سب سے چھوٹی بی بی کی آنکھ پہ عشق کا ذائقہ ابھی تازہ چڑھا تھا۔ ساری بیبیوں نے انہیں بڑی خوش دلی سے بھلیکار (خوش آمدید) کہا تھا۔ ان سے آنا جانا ترک کرنے پر شکوے کیے تھے۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا، شادی کی گہما گہمی دونوں گھروں میں اپنے عروج پر تھی۔
"اعجاز نبی شاہ نے دوسری شادی کیوں کی؟" اس نے ماں سے سرگوشی میں پوچھا۔
"اعجاز نبی شاہ بابا کو منگھرار (میراثن) سے عشق ہو گیا تھا، پہلی بی بی کا تقوی پرہیز گاری اس منگھرار (میراثن) کے ٹھمکے اور ناچ کے آگے دھری کی دھری رہ گئی، تب بڑی جیجی اکثر آہ بھر کے کہتی بس
"لاں۔۔ النڈیوں لاڈ کن، ستیوں ستائیں" (طوائفیں ناز اٹھوائیں، پرہیزگار نیک منتیں کریں۔)
اس نے اکثر سنا تھا جو بر سہاگن، وہ جگ سہاگن مگر اس کے برعکس لوگوں میں بی بی عطیہ کی عزت بی بی نغمہ سے زیادہ تھی، شاید جگ میں بی بی عطیہ کا خلوص، پاک بازی اور نیک نامی نغمہ گانے والی سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔
وہ سندھیا کے ساتھ بہت جلد گھل مل گئی تھی۔
اپنی جاب کے بارے میں سندھیا کو بتایا تھا۔
"تو آپ فیاری میں کب اپنی این جی اوز بنائیں گی؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔
"بھئی، جب میرا ڈرانسفر فیاری ہو جائے گا تب، فی الحال تو میں بدین میں ہوں۔" ماروی نے اسی خوش دلی سے جواب دیا۔
اسی وقت بی بی عطیہ سونے کا بھاری سیٹ لے آگئیں۔
"اماں! میں یہ نہیں پہنوں گی میں میچنگ جیولری لے آئی ہوں۔"
"برادری کی ساری عورتیں سونے کے زیورات پہنیں گی تم یہ نقلی پہنو گی لوگ ہنسیں گے نہیں۔"
بی بی عطیہ تنبیہ کرتی ہوئی چلی گئیں۔
"دیکھا تم نے؟" سندھیا جھنجلائی۔
"تم لوگوں کے ہاں یہ رواج ہے تو پہن لو۔" وہ کہتے ہوئے واش روم میں گھس گئی۔ پیچھے سندھیا برے برے منہ بناتی رہی۔ جب وہ دونوں تقریب میں پہنچیں تو ماروی نے کہا۔

"یہاں تو ہر طرف سونا ہی سونا ہے' آپ کی اماں بھی صحیح ہی کہہ رہی تھیں۔" اس نے خاندان کی عورتوں کو غور سے دیکھا اور سارو کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دی۔

ہالا کی مسکراہٹ لہک لہک کر گا رہی تھیں اور ناچ ناچ کے پیسے اٹھا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات گئے لاویں دینے کی رسم شروع ہو چکی تھی' دولہا مسجد سے نفل پڑھ کر سیج پر دونوں گھٹنے ٹیک کر آبیٹھا' بیچ میں تکیے رکھے تھے۔

دوسری طرف دلہن گھونگھٹ میں بیٹھی تھی' لاویں دینے روایت کے مطابق پہلے مرد آئے تھے۔

اعجاز نبی شاہ' انوار نبی شاہ لاویں دے کر چلے گئے' تو نور العارفین آیا' آمنے سامنے بیٹھے دولہا' دلہن کے سروں پہ ہاتھ رکھ کر دونوں کے سر زور سے ٹکرائے۔

"آہستہ بھائی!" شہزین چیخی" آپا نے اس کے ہاتھ پر چپت رسید کی۔

"آپا! زور سے ٹکریں مارنے سے محبت شدید ہوگی میاں بیوی میں۔"

"پھر تو آپ کو اجازت ہے ادا! ہمارے سر اور بھی زور سے ٹکرائیں۔"

"تم چپ کرو' دولہے میاں! سیج پر زیادہ نہیں بولتے۔"

"توبہ توبہ' آپا! نہ ہنسنے دیتی ہو' نہ بولنے کہ قحط پڑ جائے گا' آپ نے سیج پر جیتا جاگتا انسان بٹھایا ہے' کوئی بوتا نہیں۔"

"اللہ پناہ میں رکھے بوتا بننے سے' زین! تم جب بھی بولو گے غلط بولو گے۔" آپا نے اس کے بازو پر چپت رسید کی۔

"ادا! گھوٹ (دولہا) کی یہ عزت ہے۔" زین نے چپت پہ دہائی دی۔

"گھوٹ کی اگر یہ عزت ہے تو بھئی ہم باز آئے ہمیں اپنی عزت بڑی پیاری ہے۔" نور العارفین نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا اور واپسی کے لیے پلٹا۔

"ادا! واپس کہاں جا رہے ہو' پہلے گھوٹ (نیگ) دو؟" شہزین نے اس کے گلے میں پڑی ہوئی اجرک کا کونا پکڑا۔

اس نے چند سو کے نوٹ دولہا دلہن کے سروں کے اوپر سے گھما کر سہرے گانے والی عورتوں کو تھمائے۔

"یہاں بھی رکھیں۔" شہزین نے دولہا دلہن کے بیچ تکیے پر رکھی چاندی کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا' لاویں دینے کے بھی پیسے ہوتے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے جیب سے ایک ہزار کا نوٹ پلیٹ میں رکھا۔

"روپے نہیں ریال نکالو۔"

"میری جیب میں ایک ریال بھی نہیں۔"

"ایک ریال نہیں' ایک ہزار ریال۔"

"پھر تو واقعی نہیں۔" اس کے ایک دم سے کہنے پر زور کا قہقہہ پڑا تھا۔

واپس مڑتے ہوئے اسٹیج کے کونے پر کھڑی سندھیا کو دیکھ کر وہ اس کے پاس آگیا۔

"آپ لاویں نہیں دیں گی کیا؟"

"نہیں' دھکم پیل دیکھ رہے ہیں' ویسے یہ لاویں وغیرہ فضول رسمیں نہیں ہیں؟" اس نے نور العارفین کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

اس نے سندھیا کے چہرے کو بغور دیکھا اور مسکرا دیا۔

"نہیں۔ یہ تو ہماری ثقافت ہے' یہ رسمیں ہمیں سندھ دھرتی نے دی ہیں۔"

"اچھا' کہا تو یہ جاتا ہے' یہ غیر اسلامی رسمیں ہیں' اس لیے اب شہروں میں کم ہو رہی ہیں' البتہ دیہاتوں یا چھوٹے شہروں میں شادی ان رسموں کے بغیر نہیں ہوتی۔"

وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی' اس کی آواز انتہائی دھیمی اور نظریں ابھی تک ایک کے بعد دوسری ہونے والی رسموں پہ تھیں۔

"اسلام کسی بھی ثقافت پر حملہ نہیں کرتا' وہ عقائد

تبدیل کرتا ہے' بے ضرر رسومات نہیں' تب ہی تو برصغیر پاک وہند میں جتنے بھی صوفیاء کرام آئے' انہوں نے عقائد پر توجہ دی' رسومات پر نہیں' اس لیے کہ وہ یہاں کی ثقافت تھی' تم دیکھو تو مسلمان ہونے کے بعد بھی یہاں کے لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ وہی رہا بلکہ وہاں سے جو اولیاء' وصوفیاء آئے' وہ بھی ثقافتی طور پر ان کے رنگ میں رنگ گئے' تب ہی وہ یہاں کی غیر مسلم قوموں کو اپنے قریب کرنے میں کامیاب ہوئے' انہوں نے یہاں کے لوگوں کے دلوں کو نفرت سے نہیں' محبت سے فتح کیا تھا' عربی ثقافت ورسوم سے نہیں' اسلامی عقائد ومساوات سے وہ فاتح قلوب کہلائے۔"

وہ اس کا مدلل جواب سن کر بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ "آپ تو دس سال سعودی عرب میں رہ کر بھی ذرا نہیں بدلے۔" پہلی بار اس نے عارفین شاہ کی طرف دلچسپی سے دیکھا۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"سندھی کہیں بھی چلے جائیں سندھیا شاہ! رہیں گے سندھی ہی۔ ان کے اندر سے وہ تصوف' وہ محبت کبھی ختم نہیں ہوگی' بلکہ سندھ سے دور رہ کر اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے' میں نے شاہ کو یہاں صرف دوسروں کی زبانی چند بیتوں میں سنا' مگر وہاں شاہ جو رسالو پورا پڑھا' یہاں سندھ کی تاریخ کے بارے میں لاعلم تھا' مگر وہاں رہ کر سندھ کی تاریخ پر کتابیں زیر مطالعہ رہیں' رچرڈ برٹن لکھتا ہے ناکہ "سندھ میں دو باتیں زیادہ توجہ کے لائق ہیں' ایک یہ کہ سندھ نے بہت سارے اولیاء پیدا کیے' دوسری یہ کہ سندھ کے لوگوں میں تصوف عام ہے۔" اس کے چہرے پر اپنی دھرتی کے پیار نے ایسے دلکش رنگ بکھیرے تھے کہ وہ دیکھتی رہ گئی۔



وہ ماروی کو رخصت کرکے جیجی کے کمرے میں آگئی تھی۔

"جیجی تھک گئی ہیں آپ؟" وہ پائنتی بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔

جیجی نے اثبات میں سر ہلایا' وہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔

"ہاں۔۔ لالی۔۔ سندھیا!" کچھ دیر بعد ان کی آواز ابھری' اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"کبھی بندوں سے محبت نہ کرنا' اگر ہم نے بھی بندوں کے بجائے رب سے لو لگائی ہوتی' تو آج ولی ہوتے۔" جیجی نے بہت گہری سانس لی۔ ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ وہ حیرت سے سن بیٹھی رہ گئی' جیجی نے ایسا کیوں کہا۔

"کیا کسی سے دل لگانا اپنے اختیار میں ہوتا ہے؟" اک بہت بڑا سوالیہ نشان اس نے سوچ کے قلم سے عین دل کے بیچ لگایا تھا' جیجی نے کروٹ بدل لی تھی اور وہ اسی کھوئے کھوئے انداز میں اٹھ کر وہاں سے آگئی۔

" نور العارفین بار بار میری راہ میں کیوں آجاتا ہے؟ میری منگنی ہوچکی ہے پھر بھی میرا دل۔"

وہ بے آواز رونے لگی' آنسو یں قطرہ در قطرہ اس کے رخساروں پر یوں بہتے رہے' جیسے کوہستان میں اونٹوں کی قطار۔

اس کی روح کا سفر تو بخارا سے ٹھیاری تک کا تھا۔ وہ کیا کرتی' کیسے بھاگتی اس سے' بخارا سے بھکر' روہڑی' بھکر سے اُچ۔ اُچ سے ٹھیاری' اور ٹھیاری سے' ٹنڈو' نوابشاہ' کی 'ہالا' بدین' خیرپور' سکھر' میرپورخاص' ٹھٹھہ اور سندھ کے ہر اک کونے میں سید پھیلتے گئے' مگر یہ سفر تو عشق کا تھا' اللہ سے' اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے' دین سے' اسلام سے' اور کبھی اس کے بندوں سے۔ عشق تو ہمیشہ ہر جگہ کار فرما رہا ہے' اس کی ذات کے اندر یہ سفر کب سے شروع ہوا' شاید تب سے جب بخارا سے سید جلال الدین کبیر' سید جے بکھر آگئے' اور غیبی اشارے کے تحت سید بدر الدین بکھری کی بیٹی کا رشتہ طلب کیا مگر سید بدر الدین نے پردیسی مسافر ہونے کی وجہ سے سید ہونے کا ثبوت طلب کیا' سید بدر الدین کو مراقبے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سید جلال الدین کے سید ہونے کی بشارت کے بعد رشتہ دے کر خاندان میں شامل کر دیا۔

یہ کیسا عشق کا سفر تھا کہ جب مخدوم ساحر شجار دسویں صدی میں' ٹھیاری آئے تو پیر لیے کرکے نہ سوئے کہ یہاں چاروں جانب سیدوں کی حویلیاں ہیں۔ ٹھاری سیدوں کا قلعہ جب اک آری نام کا بندہ مٹ منے راستے پر رکھے' مسافروں کو پانی پلاتا تھا' مٹ' آری' سے ٹھیاری ہوگیا۔

اور پھر ٹھیاری عشاقوں کا' مشتاقوں کا' مسافروں کا مرکز بن گیا' کیونکہ ہالا جیسا ہیرا اس کے قبضے میں تھا۔ وہ ہالا جس کی اک بھٹ (ٹیلے) کو وہ مقام حاصل ہوا کہ اس کی ریت کو چومنے مشتاق ہندو سندھ سے عقیدت کے پھول لیے جوق در جوق چلے آتے تھے۔ کیونکہ وہ بھٹ شاہ کی بھٹ تھی۔

شاہ جو شاعروں کا سرتاج شاعر تھا' جس کے بیتوں کے ٹکڑے مصرعے زبان زد عام تھے' جس کے بیتوں کے بغیر گفتگو نامکمل رہتی' وہ شاہ جسے عشق نے شاعر بنایا' اور عشق نے اسے خدا سے ملا دیا' اور وہ نمانی سندھ کی نمانی سندھیا شاہ تھی' جس کی روح عشق کی مسافر تھی' وہ چاہے جب بھی کہیں بھی' کسی بھی زمانے میں عالم دنیا میں آتی تب بھی عشق سے مکر نہ پاتی۔

عشق اس کی ذات کا' روح کا حصہ تھا' اس کا دل جو ازل سے مسکن عشق تھا' اور اس کا جسم اس زمین پر پلا جو کہ سرزمین عشق تھی' جس کے کونے کونے میں محبت کی کونپلیں پھیلی ہوئی تھیں' نور شاہ عطائیؒ نے ان کونپلوں میں سے چند کو چن کر اپنی بیتوں کا لباس پہنا کر امر کر دیا تھا۔ سندھ کی مٹی میں محبت ایک عجیب فنا کر دینے والی فصل تھی' جو ہر جگہ لہلہا رہی تھی محبت نے اس زمین کو اپنا ہر روپ سونپا تھا' ہر رنگ دیا تھا' اور اس کے گلی کوچوں میں' کھیتوں کھلیانوں میں' شہروں گوٹھوں میں' اپنی خوشبو پھیلا دی تھی' اور یہ اتنی بہادر محبتیں تھیں کہ بندوق کی نال' کلہاڑی کا پھل' پھانسی کا پھندہ اور زہر کی پڑیا' ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے' یہ فنا نہیں ہوئیں' انہوں نے بہت سوں کو فنا کر دیا۔ محبت کو آج تک کوئی فنا نہیں کر سکا۔ یہ سندھ کے ذرے ذرے میں موجود تھی' موجود ہے' موجود رہے گی۔

کیونکہ یہ ماروی کی وفا کی سرزمین تھی۔ مومل کے سحر کی' اور سسی کی صعوبتوں کی' اور نوری کی عاجزی و عشق کی مٹی تھی یہ' اس کے خمیر سے شاید ہی کوئی بچ پایا ہو' یا بچ پائے گا' سندھ جس کی مٹی میں عشق گوندھا ہوا تھا' اور جس کا ہر ذرہ محبت سے منور اور عشق سے تاباں تھا' اور سندھیا شاہ نے اس مٹی کا اناج کھایا تھا' اس کے دریا سے پانی پیا تھا۔



وہ بہت خوش تھا' زندگی میں پہلی بار جو دل میں اتری تھی اور وہ کوئی غیر نہیں اس کی ماموں زاد تھی' اس کے جلنے میں اب صرف بیس دن رہ گئے تھے' اور ان بیس دنوں میں اس نے اس کو اپنے نام کروانا تھا۔

"نور العارفین۔۔!" اماں کی پکار پر وہ اس کے تصور سے باہر نکل آیا۔

"بیٹا! پھر جاؤ' کوئی دل کو پسند آئی؟" بی بی آمنہ اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

وہ بے ساختہ جھینپ کر مسکرایا۔ بی بی آمنہ نے اس کی آنکھوں کی روشنی کو بغور دیکھا تھا۔

"وہ کون ہے' کیا نام ہے؟ جس کا خیال آتے ہی میرے بیٹے کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔"

"سندھیا شاہ!" اس نے سرشاری سے کہا۔

بی بی آمنہ کا چہرہ فق ہوگیا۔ "مگر۔۔ مگر بیٹا! یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں اماں؟" وہ اضطراب سے کھڑا ہوگیا۔

"بیٹا! سندھیا میری بھتیجی ہے۔ اگر اس کی منگنی لوا حسن علی کے بیٹے سے نہ ہوئی ہوتی' تو میں خوشی سے اسے تمہارے لیے مانگ لیتی۔ مگر اب یہ ممکن نہیں خاندان میں اور بھی خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ ان ہی میں سے جو دل کو بھائے مجھے بتادو۔"

"اماں! یہی تو دکھ ہے کہ دل ہی اپنا نہیں رہا۔" وہ کرب سے بولا۔

اوربی بی آمنہ کے بدن سے جیسے جان نکلتی جارہی تھی' ان کا بیٹا یہ کیا روگ لگا بیٹھا تھا' اور انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔

"سندھیا نے مجھے کیوں نہیں بتایا' نورالعارفین کو ملال نے آگھیرا' بتا بھی دیتی تو کیا میرا دل قابو میں آجاتا' اور وہ بھلا مجھے کیسے بتاتی' اس نے تو مجھے کوئی آس ایسی نہیں بندھائی' میرے اتنی بار اظہار محبت کے باوجود' اس نے ابھی تک مجھ سے کوئی جوابی اظہار نہیں کیا ہے شاید یہی بات تھی جس کو میں اس کی جھجک سمجھ رہا تھا' کیا محبت کے مسافروں کا واپس پلٹنا ممکن ہے؟ اس نے بہت وقت سے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

واپسی کا ہر راستہ بند تھا۔ فرار کی ہر راہ مسدود تھی' اور آگے کے ہر راستے پر صرف وہ کھڑی تھی۔

اور یہ بے اختیاری ہی تھی کہ رات ہونے تک وہ شدید بخار میں پھنک رہا تھا' اور بی بی آمنہ کا چین و سکون غارت ہو گیا تھا' وہ ساری رات بیٹے کے سرہانے بیٹھی تسبیح پڑھتی رہیں' دعائیں درود پڑھ کر اس پہ دم کرتی رہیں' زین العابدین باربار آکر اس کا بخار چیک کرتا رہا۔

وہ بار بار کہتا۔ "اماں! ادا نے بہت جفاکشی کی ہے۔ بہت زیادہ بھاگ دوڑ کی تھکاوٹ کی وجہ سے اسے بخار آگیا ہے۔"

اوربی بی آمنہ خاموش ہو جاتیں' جو بات وہ ابھی گھر میں نہیں بتا پا رہی تھیں' وہ کیسے کہہ سکیں گی' اعجاز نبی شاہ سے' جیجی سے بھابی عطیہ سے۔ وہ کس مشکل میں آپڑی تھیں' اک طرف لخت جگر کا معاملہ تھا' دوسری طرف خاندان کے بکھرنے کا ڈر تھا' ادا حسن علی کیا سوچے گا کہ میری بہن نے ذرا خیال نہ کیا' میرے بیٹے کی منگ کو اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا' ماضی قریب میں کوئی ایسی مثال خاندان میں نہیں ملتی۔ وہ دامن جس میں ساری عمر نیک نامی سمیٹی تھی' وہ خاندان میں' حلقہ احباب میں سب کی حال بھلیائی (حال سے واقف' دکھ سکھ سننے والی) تھیں' اور اب اس عمر میں آکر کون سی رسوائیاں ہونے والی تھیں۔

دوسری طرف نورالعارفین تھا' جو شروع سے نہایت ذمہ دار اور گھر والوں کے لیے چھپر چھاؤں بنا رہا' دھرتی سے دور سخت محنت کرتا رہا' اپنی ساری ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا تھا' اس نے زندگی میں ایک خواہش کا اظہار کیا تھا' وہ کیسے اس کی وہ خواہش رد کر دیتیں' انہوں نے نورالعارفین کی پیشانی چومی' اور فجر کی اذان سن کر اٹھ گئیں۔

نماز و درود سے فارغ ہو کر وہ پھر اس کے کمرے میں آئی تھیں' اس وقت زین اور شہزین بیٹھے ہوئے تھے۔ نورالعارفین سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اطمینان ہوا۔

"بخار کم ہے اب۔" زین نے بتایا۔

"اللہ کا شکر ہے' تم لوگ بیٹھے ہوئے ہو نا؟"

"ہاں اماں! آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہم بیٹھے ہیں۔" شہزین نے انہیں دلاسا دیا۔

"اچھا۔ میں ذرا جیجی کے ہاں سے ہو کر آتی ہوں تم لوگ اس کو اکیلا نہ چھوڑنا۔" وہ انہیں تاکید کر کے سیدھی جیجی کے کمرے میں آگئیں۔

"اری! تم اتنی صبح! سب خیر ہے نا؟" جیجی نے قرآن کے اندر جزدان کا کونا بطور نشانی رکھ کر قرآن بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جیجی! سب خیر ہے۔"

جیجی نے نزدیک کا چشمہ اتار کر دور رکھ دیا۔

"کچھ پریشان ہو ادی آمنہ! کیا بات ہے؟"

"جیجی! وہ میرا نورالعارفین...!" ان کا گلا رندھ گیا۔

"کیا ہوا اسے؟"

"جیجی!" انہوں نے دوپٹے سے آنسو پونچھے "اسے روگ لگ گیا ہے۔" انہوں نے بڑی دقت سے کہا۔

جیجی کی سانس جیسے رک سی گئی تھی' کیا سندھیا اور نورالعارفین... یا اللہ! یہ... اف سندھیا کا رویا رویا سا چہرہ' کھویا کھویا انداز سب ان کے سامنے آگئے۔

"جیجی... جیجی! میں ادا حسن علی کو کیا منہ دکھاؤں

گی' اور بھلا بھا اعجاز نبی کیسے مانے گا' اور نورالعارفین کہ جب سے پتا چلا ہے' بخار میں تپ رہا ہے' پتا نہیں یہ تپ ہے یا تڑپ ہے جیجی؟" انہوں نے اک بہت گہری سانس لی تھی۔

"جیجی! میں کیا کروں اب۔ یہ بات سوچتی ہوں تو سارا ریشہ ہوجاتا ہے۔"

جیجی خاموشی سے آنکھیں بند کر کے تسبیح پڑھتی رہیں' سکوت کے بہت سارے لمحے بیت جانے کے بعد وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئیں۔

"سب چھوڑ دے رب کی مرضی پر' جو لکھا ہو گا' وہی ہو گا' ہم تم سب اس کی مرضی کے آگے بے بس ہیں' فی الحال بات کو پھیلاؤ نہیں' حسن علی نے تمہارے بیٹے کی خوشی کو پورے طریقے سے نبھایا ہے' شادی کے انتظامات میں مصروف رہا۔ ابھی سے یہ بات کرو گی' کیا گزرے گی اس کے دل پہ۔"

"ہاں جیجی! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ "آپ سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیجی!"

"اللہ بہتر کرے گا۔ اک بندے کے من میں' دوجی اللہ کے۔" انہوں نے چھوٹی بہن کو دلاسا دیا' ان کے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی برآمدے میں آئیں۔ سندھیا ان کے تخت پر نیم دراز تھی' انہیں دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آئیے آئیے جیجی! آج ناشتہ اکٹھے کرتے ہیں۔"

"آج ناشتہ کا خیال کیسے آگیا؟ تم نے تو پڑھائی چھوڑی تو ناشتہ بھی چھوڑ دیا تھا۔"

"بس جیجی! آج بھوک لگی تھی' سو امینہ کو کہا کہ ناشتہ بنا دے۔" وہ غور سے اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی رات بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔ بے نام سی اداسی تھی' جو اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی' وہ عجیب کیفیات میں گھر چکی تھی' عجیب دوراہے پر تقدیر نے اسے لا کھڑا کر دیا تھا۔ سالوں کے بعد تابع دار دل اپنی مرضی چلا رہا تھا' اور آگے پتا نہیں تقدیر میں کیا لکھا تھا' رات کھانا نہیں کھایا تھا' صبح اسے بھوک محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی اس نے ملازمہ کو ناشتے کا کہا تھا' ورنہ وہ صرف چائے لیتی تھی۔

امینہ نے ٹرے اس کے سامنے رکھی' اس نے پراٹھے کا پہلا نوالہ لیا۔

"آمنہ آئی تھی۔" جیجی نے دھیمے لہجے میں کہا' اس نے سر اٹھا کر جیجی کو دیکھا' ان کا انداز کچھ بدلا بدلا سا تھا۔

"کہہ رہی تھی' نورالعارفین کو بہت تیز بخار ہے۔" نوالہ اس کے حلق میں پھندا بن کر اٹک گیا تھا' اس نے بڑی دقت سے اسے نگلا تھا۔

"تم اپنی ماں کو کہنا کہ جا کر اس کی طبیعت پوچھ آئے' مجھے تو اس جوڑوں کے درد نے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

نوالہ اس کے سینے میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگی۔

"کیا۔ کیا میں ساری رات اس لیے بے چین رہی کہ وہ بیمار تھا' یہ کیسا جذبہ ہے محبت' اس کی آنکھیں یہ سوچ کر ہی نم ہو گئیں' اچانک اس کی بھوک اڑ گئی۔

وہ سر جھکائے کتنی ہی دیر اپنی سوچوں میں گم رہی۔

"سندھیا...! اماں! چائے ٹھنڈی ہو گئی۔"

اس نے نم آنکھوں سے جیجی کے دھندلے عکس کو دیکھا' اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جیجی نے بڑے دکھ سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور انہیں یقین ہو گیا یہ جذبہ یک طرفہ نہیں دو طرفہ ہے۔

"دیکھا جیجی! مجھے باورچی خانے میں آکر پوچھا' فریج میں قیمہ ہے' میں نے کہا ہاں پڑا ہوا ہے' کہا۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے' جلدی سے قیمے والا پراٹھا بنا کر لاؤ' میں نے سارے کام ادھورے چھوڑ کر اس کے لیے ناشتہ بنایا' اور اب دیکھو ایک نوالہ لیا اور سارا پراٹھا جوں کا توں پڑا ہے۔" امینہ برتن سمیٹتے بڑبڑاتی رہی۔

اور جیجی نے اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا' یقیناً اب بیٹھی رو رہی ہو گی' یا اللہ! تو ہم سب پر رحم کر۔

ڈھکیں ڈھکن ہار' ڈیڈی پائندناہ جو۔

(اے عیب پوشی کرنے والے! اپنی پناہ کے پلو سے ڈھانپ جا۔)

شاہ لطیف کے بیت کو دہرایا اور آنکھیں بند کرلیں، تسبیح کے دانے ان کے ان دیکھے آنسوؤں کی طرح گرتے رہے۔

☆ ☆ ☆

گھر کے سارے افراد نورالعارفین کی خواہش کی تائید کرنے لگے تھے سب نے بی بی آمنہ کو مجبور کردیا تھا کہ وہ ملا اعجاز نبی شاہ سے رشتہ مانگنے جائیں، کتنے دنوں تک وہ چپ رہیں، جیجی کو جاکر بتایا تو وہ بھی چپ رہ گئی تھیں، نورالعارفین کے جانے میں اب صرف تین دن رہ گئے تھے، اور گھر میں اصرار بڑھتا جارہا تھا، خود نورالعارفین کی پریشانی ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

"مانگ کے دیکھ لو' اللہ بہتر کرے گا۔"

"تو پھر شام کو آئیں ہم؟"

"آجاؤ۔" جیجی نے اک گہری سانس لی۔ "عارفین کو کہو، مجھ سے مل جائے، پتا نہیں پھر حالات کیسے ہوں؟"

"جی بستر میں بھیجتی ہوں اسے۔"

اس نے پھوپھو جان کو جیجی کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بے چینی سے جیجی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"جیجی...!" آگے اس نے ایک لفظ نہیں بولا تھا، جیجی نے اس کی نم آنکھوں، ہراساں وجود کو دیکھا اور اپنی گود پھیلادی، اس نے جیجی کی کمر میں بازو حمائل کرکے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔

جیجی اس کی ان کہی باتیں سمجھ جاتی تھیں، اور اس کے سارے بے آواز آنسو اپنے پوروں پر چن لیتی تھیں، اس وقت بھی وہ اپنے آنسو جیجی کی گود کو سونپ رہی تھی۔

جیجی کا دامن سب کے دکھ سمیٹنے میں بہت وسیع تھا، انہیں بے کہے دکھ، ان کہی باتیں، اور پوشیدہ بکھری محبتیں، سنبھالنے، سمجھنے، سمیٹنے کا ہنر آتا تھا، ان آنکھیں چشمے کے پیچھے سے چمکتی رہتیں، اور گلاب پنکھڑیوں جیسے لب ہمہ وقت مسکراتے رہتے انہیں دکھ میں مسکرانا آتا تھا۔ وہ سوچتی جیجی مسکراتی ہیں، مگر اب اسے پتا چلا تھا کہ جیجی کو محبت طاقت ہر غم سہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے، محبت، طاقت کا اندازہ اسے اب ہوا تھا، اور جیجی کی طاقت اس نے اب جانا تھا، ان کی باتیں موتیوں کی مانند ہوتیں، جو بیٹھتا بیٹھا ہی رہ جاتا، شاہ کے بیتوں سے ٹکڑے ان کی بات چیت کا حصہ ہوتے ان کی آنکھیں مدینہ کے ذکر پر نم ہوجاتیں، ان کی رگ رگ سے محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے، وہ تلقین کرتیں کہ محبت اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے کی جانی چاہیے اور جب اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا تو وہ مضبوط طاقت ور بوڑھی جیجی کمزور پڑجاتیں، ان کے رخساروں پر اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں بہنے والے آب زم زم جیسے میزان عمل پہ بھاری اور گناہوں کو دھوڈالنے والے، اور فرشتوں پر کپکپی طاری کرنے والے آنسوؤں کی قطار چشم عشق سے نمودار ہوتی۔

یہ منظر وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی، تب وہ سوچتی۔ جیجی ایک دم اچھی بھلی بیٹھی ہوئی ہنس رہی ہوتیں اور مدینے کا ذکر آتا، جیجی آبدیدہ ہوتیں پھر رونے لگتیں۔

اسے جیجی کا ایک دم رونا، عشق کی چوٹ لگنے تک سمجھ میں نہیں آیا تھا، اسے اب پتا چلا تھا کہ محبت، خیال اور نم آنکھوں کا آپس میں کتنا گہرا اور انوکھا رشتہ جڑا ہوا ہے۔

جیجی کا نرم و گداز جھریوں بھرا ہاتھ اس کے بالوں کو سنوارنے لگا، اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوچکا تھا، اس نے سر اٹھاکر جیجی کو دیکھا پھر اس کی نظر کھڑے ہوئے عارفین پر پڑی۔ وہ ایک دم اٹھ کر پلنگ کے کونے، سمٹ کر بیٹھ گئی، اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر نورالعارفین بیٹھ گیا تھا۔

جیجی نے پیار سے اس کی پیشانی چومی اور اس کی پشت سہلانے لگیں۔

جیجی تشریح کرتی جاتیں اور شاہ سائیں کے بیت پڑھتی جاتیں، مدینہ کے شاہ مدینہ کے میر۔ مدینہ کے والی۔ مدینہ کے جام۔

"... کے مسافر! مدینے جاکر پریں (محبوب) کو سلام پیش کرنا میری طرف سے۔"

وہ پشت پر ہاتھ پھیر کر اسے پیغام دیتی رہیں، اور نورالعارفین کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگتی رہیں، وہ ادب سے جھک کر بار بار ان کا ہاتھ چوم لیتا۔

وہ پلنگ کے کونے پر سر گھٹنوں پر ٹکائے بیٹھی تھی اور نورالعارفین کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں، وہ اسے دیکھ رہا تھا، اور وہ نظریں جھکائے اسے محسوس کررہی تھی، عورت اور مرد میں یہی فرق ہے، مرد دیکھتا ہے، عورت محسوس کرتی ہے۔

"کس وقت جارہے ہو؟"

"جیجی! پرسوں رات کو۔"

سندھیا شاہ کی آنکھیں بھیگ گئیں، اس نے سر گھٹنوں پر ٹکادیا۔

"اچھا جیجی! چلتا ہوں۔" لمبی خاموشی کے بعد اس نے سوچا، اس کا زیادہ بیٹھنا مناسب نہیں جبکہ سندھیا بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھی، جیجی نے گلے لگاکر اس کو بے شمار دعائیں دیں، اس نے اک الوداعی نگاہ سندھیا پر ڈالی، اور سر جھکاکر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔

سندھیا نے آنسو بھری آنکھوں سے جیجی کو دیکھا اور جیجی کی سب کو سمیٹنے والی سندھ دھرتی جیسی گود نے اس کو سمیٹ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ادی آمنہ! آپ نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے، یہ بات کہہ کر۔" اعجاز نبی شاہ نے نرمی سے کہا۔

بی بی آمنہ کی نظریں مدعا سنانے کے بعد جھک گئی تھیں۔

"ادا! اولاد مجبور کردیتا ہے۔" انہوں نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"اولاد کہے گا، پھانسی پر چڑھ جاؤ یا کنویں میں کود جاؤ تو نہ پھانسی پر چڑھیں گے نہ کنویں میں کودیں گے، آپ کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ میں نے آپ کی بات مان لی تو حسن علی زندہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے لیے مرجائے گا، یا ہم اس کے لیے مرجائیں گے، ہم خوشی غمی میں ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے۔"

"جی ادا!" انہوں نے بھیگی آنکھیں دوپٹے کے پلو سے صاف کیں۔

"کیا آپ چاہتی ہیں کہ حسن علی کے ساتھ ہم اتنی بڑی ناانصافی کریں؟" اعجاز نبی نے غصے سے انہیں دیکھا۔

"نہیں ادا! ایسا تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

"تو پھر حقیقت میں رشتہ مانگنے کیوں آئی ہو؟" اعجاز نبی شاہ کا لہجہ طنزیہ، استہزائیہ ہوگیا۔

"ادا! مجھے کیا پتا تھا کہ سندھیا نورالعارفین کو پسند آجائے گی، اگر پتا ہوتا تو چھ سال پہلے ہی نہ مانگ لیتی آپ سے۔"

"دیکھو ادی آمنہ! ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو، یہ ہم میں سے کسی کے بھی حق میں نہیں ہے، ہم سب جو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں، بکھر جائیں گے، لوگوں کی لعن طعن الگ سہنی پڑے گی، اب یہ نہیں ہوسکتا، ہاں اگر سندھیا کی منگنی مرتضیٰ سے نہ ہوئی ہوتی تو میں بخوشی نورالعارفین کا رشتہ قبول کرتا، نورالعارفین مجھے بھی عزیز ہے، آپ کی اولاد میری اولاد ہے ادی! مگر یہ بات آپ اب زبان سے کبھی نہ نکالنا، خوامخواہ کی جگ ہنسائی گلے پڑے گی، نورالعارفین کو بھی سمجھادینا، ہمارے خاندان میں منگنیاں توڑ کر دوسری جگہ رشتے نہیں دیے جاتے۔"

بی بی آمنہ نے امداد طلب نظروں سے جیجی کو دیکھا، وہ ساری باتیں سن رہی تھیں، اور ابھی تک غیر جانب دار تھیں۔

"ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا جو نصیب میں ہے، وہ

تو ہوگا ہی۔" جیجی نے تبصرہ کر کے اپنی توجہ تسبیح پر مرکوز کر دی۔ ان کی تسبیح کے دانے ان کی نرم گلابی انگلیوں کو پھلانگتے رہے۔ ان کے چہرے پر کوئی بھی تاثر واضح نہیں تھا۔

"ماروی! آپ میری بہن ہو' میرا گھر تمہارا گھر ہے' سو بار آؤ' مگر اس سلسلے میں میرے پاس آج کے بعد نہ آنا۔" اعجاز نبی شاہ نے اٹھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے کہا اور حویلی سے باہر نکل گئے۔

وہ ناامید واپس لوٹیں تو اس کا اترا ہوا منہ دیکھ کر ہی سب کو اندازہ ہو گیا کہ جواب کیا ہے۔ یہ جواب ان کی توقع کے خلاف نہیں تھا۔

دونوں گھرانوں کے بیچ عجیب تناؤ سا آگیا تھا' وہ واپس لوٹا تھا۔ آنکھوں میں سپنے سجائے' دل میں اس کو بٹھائے' ایئر پورٹ پر اس کے ساتھ سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"سر! ہمارا کام ان کی سپورٹ کرنا ہے' جیل بھجوانا نہیں' آپ پولیس کو منع کریں ان کی گرفتاری سے۔" ماروی' منیجر کی ٹیبل کی دوسری جانب کھڑی احتجاج کر رہی تھی۔

"آپ بیٹھ جائیں مس ماروی!"

وہ خاموشی سے چیئر کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"دیکھیں' مس ماروی! یہ رقم تین ماہ پہلے اسے واپس کرنا تھی' مگر اس نے نہیں کی' اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ رقم ہم پولیس کے ذریعے وصول کریں۔" ریجنل منیجر نے حتمی انداز میں کہا۔

"مگر سر! اس شخص نے پہلے دس ہزار کا قرضہ لیا' واپس کیا' دوسرے سال بیس ہزار لیا' واپس کیا' اب جو تیس ہزار لیا تھا' اس سے اس نے بھینس خریدی' اب یہ نصیب کی بات کہ منہ کھر کی بیماری کی وجہ سے اس کی بھینس مر گئی' اس کا پہلا ریکارڈ اس فائل میں کلیئر ہے' اب ہمیں اس کو رعایت دینا چاہیے۔" ماروی نے فائل ان کے سامنے رکھی۔

منیجر نے اک اچٹتی نگاہ اس فائل پر ڈالی۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ ہم اس کو مہلت دیں' لو قرضہ بھی دیں' تاکہ اس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار' ریڑھی لگالے' یا دکان' اور اس قرضے کی قسط ساتھ آدھی قسط پچھلے قرضے کی بھی ادا کرتا رہے۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے' تیس ہزار پہلے کھائے بیٹھا ہے' اوپر سے مزید تیس ہزار ہم اسے دے دیں' آپ کی تجویز ناقابل قبول ہے۔"

"سر! اس غریب نے پیسے کھائے نہیں' ان پیسوں سے اس نے بھینس لی' وہ مر گئی تو یہ نصیب کی بات ہے' اگر آپ اس کو اور قرضہ دینے پر راضی نہیں تو ایک سال کی چھوٹ دے دیں۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔

"سر! یہ تنظیمیں ان کی مدد کے لیے بنائی گئی ہیں' ہم ان کی مشکلات میں کمی کے بجائے اضافہ کر رہے ہیں۔"

"این جی اوز ان کی سپورٹ کے لیے بنائی گئی ہیں' مگر پیسے ڈبونے کے لیے نہیں' جو بھی رقم واپس نہیں کرے گا' اس کے خلاف کارروائی ہوگی۔"

"سر! یہ ظلم ہے ان غریبوں کے ساتھ' دھوکا ہے جو ہم انہیں خوش حالی کے خواب دکھا کر دے رہے ہیں۔"

"مس ماروی! اگر آپ کو ان کا اتنا ہی خیال ہے تو آپ رقم دے کر ان کی جان کیوں نہیں چھڑوا دیتیں؟"

"سر! مجھے ایسا کرنا پڑا تو میں ضرور کروں گی' آپ اس ماہ میری آدھی سیلری کاٹ لیں' مگر بابا اللہ بچایو کو پولیس کے حوالے نہ کریں۔"

"چلیں دس ہزار آپ نے دیے' بقیہ بیس ہزار کون دے گا؟"

"اس کا بھی بندوبست کرلیں گے۔"

"جب تک بندوبست کریں' تب تک پولیس کو ایک بار اللہ بچایو کے لیے ضروری ہے' اس کو سزا دی' تو ساری تنظیموں کے لوگ پیسے ضبط کرنے کے چکر چلائیں گے۔"

"سر! یہ ظلم ہے' میں اس ظلم میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔" وہ اٹھ گئی۔

اپنے آفس میں آکر بیگ اٹھایا' بدین سے ویگن پکڑی' حیدر آباد پہنچ کر بدین اسٹاپ پر اتر کر رکشہ لیا' اور دن کے تین بجے گھر پہنچ گئی۔

"بیٹا! آج اتنی جلدی آگئیں' خیریت ہے' طبیعت ٹھیک ہے؟"

"ہاں نانی! ٹھیک ہوں۔" فریج سے پانی کی بوتل نکال کر وہ ان کے پاس آگئی' اور آفس میں ہونے والی کارروائی کے بارے میں بتانے لگی۔

"بیٹا! تمہیں یہاں آنے کے بجائے اس غریب کی مدد کے لیے تھانے جانا چاہیے تھا۔"

"نانی! میں کیا کر سکتی تھی تھانے جا کر؟"

"پھر بھی سفارش تو کر دیتیں شاید وہ مار سے بچ جاتا۔"

"ہاں نانی! یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔" اس نے افسوس سے کہا۔

"گل سے بات کر کے دیکھو' ہو سکتا ہے' وہ کچھ کر سکے۔"

"واہ نانی! آپ ہمیشہ وقت پر اور صحیح مشورے دیتی ہیں۔" اس نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو گل!"

"وعلیکم ہیلو۔" اس نے اسی بشاشت سے جواب دیا جو اس کی ذات کا خاصا تھی۔

"کہاں ہو؟"

"کراچی!"

"مجھے پتا تھا' گھر پہ نہیں ملو گی' تب ہی موبائل پر کال کی' سنو تمہاری سخت ضرورت ہے مجھے۔"

"اللہ خیر کرے' میری ضرورت کیوں پڑ گئی؟" وہ ہنس کر بولی۔ ماروی نے اسے آج کی کارروائی کے بارے میں بتایا۔

"میں آتی ہوں' پھر بیٹھ کر اس کا کوئی حل نکالتے ہیں۔"

فون بند کر کے اس نے تکیہ درست کیا' اور لیٹ گئی۔

"کھانا کھالو بیٹا!"

"نہیں نانی! بھوک نہیں ہے۔" بدین کا سارا راستہ وہ کڑھتی آئی تھی' اب گل سے بات کر کے مطمئن ہو گئی تھی' وہ کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیتی۔

☼ ☼ ☼

رات بہت کٹھن تھی' بہت اداس' بے حد غمگین۔ نیند اس کی آنکھوں سے آج بھی روٹھی ہوئی تھی' اس کے کتنے آنسو تکیے میں دفن ہوئے تھے۔

اچانک اسے گھٹن کا احساس ہوا' اے سی چلنے کے باوجود۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی' سارے گھر کی بتیاں بند تھیں' وہ برآمدے سے ٹٹولتے صحن میں آئی' ہلکی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

آسمان کے آنچل پر جا بجا ستارے جھلملا رہے تھے' ان کے بیچ ادھورا چاند اسی کی طرح اداس ماتھا' اور ہجر زدہ سا سر نیہوڑائے تصور محبوب میں گم صم کھڑا تھا' وہ چبوترے پر بیٹھ گئی' آم کی گھنی اور املی کی اونچی شاخیں جھول رہی تھیں۔ گیٹ پر ایستادہ بیری کے درخت کے پیچھے سے بید کے لمبے درخت ماحول کو عجیب پر اسرار بنا رہے تھے۔

بچپن میں اسی بیری' آم اور املی کے درختوں سے اپنی اپنی مد موسم آنے پر وہ کیریاں' املی اور بیر تڑوا کر بڑے شوق سے کھاتی تھی' بہن کے ساتھ شنزین ہوتی' اور وہ دونوں مل کر نور العارفین کی منتیں کرتیں' وہ موڈ میں ہوتا تو مان جاتا' ورنہ ڈانٹ کر بھگا دیتا۔

وہ نور العارفین کی منتظر رہتیں' وہ جیجی کے پاس آکر بیٹھتا' تو وہ جیجی کے کان میں شروع ہو جاتیں' جیجی چپکے چپکے مسکائے جاتیں۔ نور العارفین ہاتھ کی انگلی اور سر انکار میں ہلا کر کہتا۔

"نہیں جیجی نہیں' ان کی سفارش نہیں کرنی۔" جیجی مسکرا کر بے چارگی سے ان کو دیکھتیں تو وہ بسورنے

لگتیں۔ بھیجی ہنس پڑتیں اور نورالعارفین سے کہتیں۔
"تمھو بابا! بیریاں توڑ کے دو۔ یہ بھلا کس کو کہیں۔ الوار نبی تو انہیں درختوں پر چڑھنے کی صورت میں ہر وقت ٹانگیں توڑنے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔"
وہ بھیجی کی پرزور سفارش پر درخت پر چڑھ کر بیریاں توڑ کر پھینکتا جب نیچے اترتا تو دونوں کے سروں پر ایک ایک چپت ضرور رسید کرتا۔
نورالعارفین بھی کے لہو کی گردش میں یہ نام دوڑنے لگا۔ کتنے دن ہو گئے نہ خط نہ خبر 'فون پہ تو جیسے پہرے لگے ہوئے تھے' وہ کسی بھی دوست سے بات کرتی تو کون تھی؟ کیوں کیا؟ جیسے سوالات کے جواب دیتے دیتے تھک جاتی "پاپا کی جب سے دوسری امی کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی تھی" اس نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ صرف شہزین ہی تو تھی جو اسے خیر خبر دیا کرتی۔ وہ بھی بہت دن ہوئے میکے آئی ہی نہیں تھی" اور پھوپھو جان تو ظاہر ہے اس کے سامنے ایسی کوئی بات ہی نہیں کرتی تھیں۔ بس بھیجی کی خاطر آجاتیں "اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح پیشانی چوم کر پیار کرتیں 'زیادہ دیر تک بیٹھنے سے گریزاں پھوپھو جان کو پہلے کی طرح اس گھر میں خوش آمدید نہیں کہا جاتا۔ بچپن اور محبت کی کئی خوشگوار یادیں اس کے گرد محو رقص تھیں۔
بھٹ شاہ کی کراڑ دھنڈ (جھیل) سے آنے والی شاہ کے سرسارنگ جیسی مدھر ہوائیں اس کے وجود کے بوسے لیتی رہیں۔ کراڑ کنارے شاہ سائیں کے سائے میں مدفون شیخ ایاز کا کلام 'صادق فقیر کی صحرائے تھر کا گداز لیے دردیلی آواز میں اس کی سماعتوں میں تازہ ہو گیا۔

سکھی پیا کھے ملیں تہ چنجاں چاندنی تو سواء تہندی

اچیں تہ منہنجی اساس میں آؤ' چھو تہ پی کلنہ ایندی

(سکھی! پیا سے ملو تو کہنا چاندنی تیرے بن نہیں ہو گی
آنا ہے تو میری اداس میں آؤ کیونکہ کوئی اور دوسری رات نہیں آئے گی)

ہجر سیاہ لباس جیسا اس کے گرد منڈلا رہا تھا' وہ کی یاد اس کے دل کو دلاسے دے رہی تھی۔
صادق فقیر کا بے صوت لحن اس کے ہر نمودار ہو کر اس کی ذات کو گھیرے ہوئے تھا۔

پرارے کا پکار آہے
مگر آلیاں تکھ یار آہے
کتھے اساں جی اکار آہے
ایاز کیڈا نہ ناؤ نیندی۔

(اس پار کوئی پکار رہا ہے' مگر میرے آگے تیز دھار پانی ہے' میرا پہنچنا کہاں ہے؟ ایاز یہ ناؤ کدھر لے جائے گی۔)
وہ گھٹنوں کے گرد بازو حمائل کیے بے تحاشا رو رہی تھی' اس کے اندر سے ایسی گھٹی گھٹی آواز نکل رہی تھی جیسے چولہے پر پانی ابل رہا ہو۔
پکھی پرو کا انجان نہ آیا' کیرتن جی ہری رہی۔
(پچھلے سال کے پرندے ابھی نہیں آئے' ان کی راہ تک رہی ہے۔)
ہجر پوری کاملیت سے اس کے وجود پر سایہ کیے ہوئے تھا' میلوں دور بیٹھے بھی کی یاد اس کو رُلائے دے رہی تھی' رُلائے جا رہی تھی' آتش ہجر میں اس کا انگ انگ جھلس رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

گل نے اس ایچ او سے فون پر بات کی' مگر اس نے منیجر کا بہانہ بنا کر' بابا اللہ بچایو کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
"اب کیا کریں؟" ماروی کی پریشانی حد سے بڑھ گئی تھی۔
وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملایا' سانگی سے بات کی۔ اس کے باپ کے مرحوم دوست کا بیٹا اکلوتا بیٹا اور اس کا بھی قابل اعتماد دوست تھا۔
"سانگی کہہ رہا ہے میں کوشش کرتا ہوں۔"
"وہ کیا کرے گا؟"

"کوئی سفارش ڈھونڈے گا' یا رشوت سے کام چلائے گا۔ آئے گا تو پتا چلے گا۔"
وہ آفس میں بیٹھ کر بدین کی معاشی حالت پر اظہار افسوس کر رہی تھی' جبکہ گل خاموشی سے سر ہلاتے تائید کر رہی تھی۔
آدھا گھنٹہ بعد سانگی ان کے آفس میں کھڑا تھا' اور گل دونوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروا رہی تھی۔
"اچھا تو آپ ہیں' گل کی اکلوتی دوست۔"
"کیوں تمہیں دیکھ کر مایوسی ہوئی؟" گل نے اس کی بات پکڑی۔
"ارے نہیں' خوشی ہوئی' بہت خوشی" آخر کوئی تو ہے اس جہاں میں جو گل کو لڑکی ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
"مسئلے کا کیا بنا' یہ بتاؤ؟" گل نے اسے گھور کر بے تابی سے پوچھا۔
"وہ تو حل کر کے آیا ہوں۔ پتا چلا کہ ایس ایچ او اپنا پرانا واقف کار ہے' اور اب بابا اللہ بچایو کو لے کر یہ مسئلہ منیجر کے ساتھ حل کرنے آیا ہوں۔" وہ مسکرا کر تفصیل بتانے لگا۔
بابا اللہ بچایو کی رہائی کا سن کر اس نے سکون کی سانس لی' وہ سب منیجر کے کمرے میں آئے۔
"السلام علیکم سر! ناچیز کو سانگی کہتے ہیں' صحافت سے تعلق ہے۔" اس نے منیجر سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔
"جی بیٹھیے۔" منیجر کی نظریں بابا اللہ بچایو پر جم گئی تھیں۔
"آپ زیادہ حیران نہ ہوں۔ اسے میں چھڑا کر لایا ہوں۔" منیجر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"اس کی بچت کی ہوئی رقم آپ سود یا شرح منافع میں کاٹ چکے ہیں' باقی اصل رقم ہزار تیس بنتی ہے جس میں سے دس ہزار مس ماروی دے چکی ہیں' اور پانچ ہزار میری طرف سے' پانچ آپ کے سابقہ سوشل آرگنائزر گل نے دیے ہیں' باقی دس ہزار کے لیے عرض یہ ہے کہ آپ کو بابا اللہ بچایو ہر ماہ ایک ہزار کی

قسط دے گا' اور اس کی ضامن' گل' میں اور مس ماروی ہیں۔" اس نے ہزار کے دس نوٹ گن کر اس کے سامنے رکھے۔
"ٹھیک ہے' مگر مجھے اس پر اعتبار نہیں' کیونکہ اس کی زرعی زمین بھی تھی اور اس کی اک بھینس بھی ہے' چاہتا تو وہ بیچ کر ہمیں پیسے دے دیتا۔" منیجر نے تندی سے کہا۔
"سائیں! وہ زمین سیم و تھور بن گئی ہے' تین بیٹیاں ہیں میری' ایک بھینس ہے' اس کا دودھ بیچ کر ان کا پیٹ پالتا ہوں' وہ بیچ کر اگر ان کو پیسے دے دوں' تو ان کو کہاں سے پالوں میں نے کہا تھا' مجھ سے قسطوں میں لے لیں پیسے' مگر منیجر صاحب نہیں مانا۔"
"بابا! بیٹا نہیں ہے آپ کا؟"
"تھا مگر اللہ لے گیا اسے' سمندری طوفان میں ہوڑے (کشتی) پر تھا' طوفان تو ٹلا مگر نہ ہوڑا کشتی آیا نہ بیٹا!" اس نے آب دیدہ ہو کر اجرک کے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔
سانگی نے اس کا شانہ تھپکایا۔ "سر! ایک قدرتی آفت نے اس کا بیٹا چھینا۔ ڈیلٹا تباہی سے زرعی زمین کو کلر چاٹ گیا' اور وبائی بیماری سے بھینس مر گئی' اوپر سے آپ نے یہ احسان کیا کہ اس غریب کو تھانے کی سیر بھی کرا دی' اور پولیس سے مرمت بھی۔"
"کبھی ایسی تنگی نا دیکھی' زمین سے اناج آتا تو آدھا کمرہ بھرا ہوتا۔" وہ غریب اپنی خوش حالی کے دور کو یاد کرتا رہا۔
سانگی نے افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔
"مجھے اپنے کالم کے لیے بہت سارا مواد مل گیا۔"
اخبار میں کالم کا سن کر منیجر ڈھیلا پڑ گیا۔
"ٹھیک ہے' مجھے دس اقساط قبول ہیں۔"
ماروی نے دیکھا' بابا اللہ بچایو کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
سادہ لوح بابا اللہ بچایو' بدین کے لاکھوں لوگوں کی طرح معاشی بدحالی کا شکار تھا' وہ بدین جس کی مٹی تیل اگل رہی تھی' مگر تیل کی بے تحاشا برکتوں نے بدین

کے لوگوں کو کچھ نہیں دیا تھا۔ ڈیلٹا کی تباہی اور پانی کی کمیابی نے یہاں کے لوگوں کو بدترین زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

تیل کی دولت سے مالا مال بدین' بھوکا سوتا تھا' اور پیاسا چلاتا تھا' کالا تیل جس کے آگے لال خون بہت ارزاں تھا' جس کے آگے انسانی 'عزت' حمیت' جان اور انسانیت کی کوئی وقعت 'قیمت' حرمت نہ رہی تھی' اس کی نظروں میں عراق کے مظلوم لوگ آگئے' سامراجی قوتیں ہر جگہ برسرپیکار ہیں' اور مظلوم کی داد رسی کے لیے کوئی طبل نہیں بجاتا' سب گونگے اندھے بن چکے ہیں۔

واقعی حکمران ہر جگہ کے اندھے بہرے ہوتے ہیں۔

گل کے آفس میں پہنچ کے بعد سائگی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا۔ اب میں چلتا ہوں' آئندہ بھی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو یاد فرمایئے گا۔"

"خادم فوراً حاضر ہو جائے گا۔" گل ہنسی۔

"بالکل!" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "اچھا مس ماروی! خدا کرے آپ کے اندر خوشبو کا شہر ہمیشہ آباد رہے۔"

اس نے بے ساختہ نچلے ہونٹ کے کونے کو دانت سے کاٹا تھا۔ سائگی کا اتنی اپنائیت سے کہنا اسے عجیب لگا تھا۔ مگر وہ خاموش رہ گئی۔



پچھلے دو سالوں میں وہ تیسری بار آئی تھیں' اور آج اعجاز نبی شاہ کے چہرے پر انہیں دیکھ کر ہی تناؤ آگیا تھا۔

"ادا! میں جھولی پھیلا کر آئی ہوں' خدا کے لیے مجھے ناامید نہ کرنا۔"

وہ جھولے میں بیٹھے تھے' وہ ان کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ تخت پر جیجی بیٹھی ہوئی حسب معمول عصر کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ برآمدے میں کھلنے والی کمرے کی کھڑکی سے نغمہ جھانک رہی تھی' اور بی بی عطیہ سندھی کڑھائی کا دوپٹہ بنا رہی تھیں'

سندھیا جو جیجی کے تخت پر نیم دراز تھی' اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھی۔

سب اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔

"ادا! مجھ سے جو عہد' اقرار لینا چاہتے ہو' ہر شرط رکھو گے' مانوں گی۔"

وہ اب بھی خاموش رہے۔

"ادا! میں ہاتھ جوڑتی ہوں' میری عرض سن لو' جو ادا!" وہ عاجزی سے کہتے ہوئے رو پڑیں۔

"ادی! میرا جواب جو کل تھا' وہی آج بھی ہے' اور ہمیشہ یہی رہے گا۔" انہوں نے غصہ ضبط کر کے کہا۔

"ادا! پورے دو سال بعد آیا ہے میرا بیٹا! میں اس کی مایوس شکل نہیں دیکھ سکتی' مجھ پہ احسان کرو۔"

"ادی! میر علی شاہ نے اپنی بیٹیوں کے رشتے اپنے بھائیوں کے بیٹوں کو دے دیے' اس کی زبان کا پاس رکھا ہم نے۔ آپ کے پاس رشتے مانگنے نہیں آئے' ورنہ دونوں لڑکیوں کے جوڑ کے لڑکے تھے' انوار نبی تھا' ادا حسن علی کا بڑا بیٹا تھا' مگر ہم نے کہا۔ جو زبان میری نے دی ہے' شہرزین کے رشتے میں وہ اس کے بعد اب ہماری زبان ہے' اب آپ آئی ہیں کہ بھائی کے بیٹے سے منگنی توڑ کر آپ کے بیٹے کو رشتہ دے دوں' آپ نے خود ہی مجھ پر اور حسن علی پر ساری برادری میں جگ ہنسائی کرائی ہے' بدنام ہو کے رہ گئے ہیں ہم' اور ہاں نور العارفین کو منع کر دیجیے گا کہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں' کہیں جیجی سے ملنے کے بہانے چلا نہ آئے۔"

"اعجاز نبی! یہ میرا بھی گھر ہے' اور وہ بچہ میری گود میں پلا ہے۔" جیجی نے انہیں تنبیہہ کی۔

"جیجی! آپ کو ملنا ہے تو انور نبی کو کہوں گا' گاڑی میں بٹھا کر آپ کو ادی آمنہ کے گھر چھوڑ آئے گا' لیجیے گا تو پھر انوار آپ کو لے آئے گا۔"

وہ غصے میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"تربیت تو بڑی اچھی کی ہے' آپ کی بی بی صاحب نے' آپ کی اکلوتی بیٹی کی' صد شکر کہ مجھے تو کوئی بیٹی نہیں ہوئی' ورنہ..." نغمہ نے نمک چھڑکا۔

اعجاز نبی شاہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ مگر وہ چپ نہ ہوئی۔

عطیہ کی بیٹی کی رائے اور رضامندی نہ ہو تو ادی آمنہ یوں جوتیاں نہ گھسائے' سب کام سندھیا کی رضامندی سے ہی ہو رہا ہے۔"

بی بی عطیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا' اگر اعجاز نبی شاہ موجود نہ ہوتے' تو یقیناً وہ اس گانے والی کو جواب دیتیں۔

"چپ ہو جاؤ نغمہ! آئندہ ایسی بکواس کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

"کیوں میں نے ایسا کیا کہا ہے' آخر ادی آمنہ بار بار انکار کے باوجود کیوں چلی آتی ہے' سندھیا کی شہہ پر نا!"

"سندھیا میری بیٹی ہے' میری عزت ہے' اب تم عطیہ کے حسد میں میری عزت' میری پگڑی اچھالو گی۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔"

کتنے عرصے بعد اعجاز نبی ان کے حق میں بول رہے تھے' بی بی عطیہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"میں کیا کہہ رہی ہوں' میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ سب عطیہ کی شہہ ہے بیٹی کو۔" وہ اعجاز نبی شاہ کا غصہ دیکھ کر دھیلی پڑی۔ "میرا تو یہ مشورہ ہے' سائیں سرہی بھری امارو (خوشبودار گٹھڑی امارو) تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں' آپ کی عزت کے لیے۔ شادی کی تاریخ طے کر دیں فوراً۔"

اعجاز نبی نے غصے سے اسے دھکا دیا تھا۔ وہ بیڈ پہ جا گری۔

"کیا... کیا دیکھا ہے تم نے میری بیٹی میں جو ایسی بکواس کر رہی ہو؟" وہ طیش سے اس کی طرف بڑھے۔

"خدا کے لیے ادا! کیوں تماشا بنواتے ہو' لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔" بی بی آمنہ نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر دور کیا۔

"میں نے کیا کہا ہے۔ جو مجھے مارنے پر تل گئے' عشق بیٹی کرے' سزا مجھے ملے۔" وہ روتے چیختے بولی'

اعجاز نبی شاہ کا یہ رویہ اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ شور پر باہر آنے والی سندھیا شرم سے دروازے پر گڑ گئی تھی۔

"میری بیٹی کے بارے میں اب اگر ایک لفظ بھی بولا نا تو طلاق دے کر واپس ہالا بھجوا دوں گا' پھر ڈھولکی بجاتی گاتی پھرنا۔"

اعجاز نبی شاہ غصے سے دبے دبے لہجے میں کہہ کر باہر نکلے' برآمدے میں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی سندھیا کو دیکھا' جس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

انہوں نے چند لمحے بغور سندھیا کی جھکی جھکی نظروں کو دیکھا' اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے تھے' اس کے وجود پر اداسی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ پچھلے دو سالوں میں بہت تبدیل ہو چکی تھی۔

آج سے پہلے یہ بات انہوں نے اتنی شدت سے محسوس نہیں کی تھی۔

وہ تیزی سے اوطاق میں آئے۔ ان کے اضطراب میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا تھا' کیا ہو رہا ہے' یہ سب کیا ہم کسی انہونی کی طرف بڑھ رہے ہیں' وہ اضطراب سے اپنی چھوٹی سی داڑھی میں انگلیاں گھمانے لگے۔

ان کے نوکر نے آکر بتایا کہ حسن علی شاہ کا منشی آیا ہے۔ مگر انہوں نے انکار میں سر ہلا کر ملنے سے منع کر دیا' تھوڑی دیر بعد ملازم پھر آیا۔

"سائیں! وہ کہتا ہے کہ سائیں حسن علی کا پیغام لے کر آیا ہے' ضروری ملنا ہے۔"

"اس سے کہو' میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ شام کو آئے۔" انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

"السلام علیکم ادا!" حسن علی کی آمد پر وہ چونک گئے۔

"وعلیکم السلام!" وہ اٹھ کر اس سے بغلگیر ہوئے۔

"کیا ہوا ادا' منشی بتا رہا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں؟" اس نے صوفے پر بیٹھتے استفسار کیا۔

"کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہا تھا' تھوڑا بہت تو چلتا رہتا ہے نا عناصر سے بنے وجود کے ساتھ' تم بتاؤ منشی کو

کس کام سے بھیجا تھا؟"

"اوا! مرتضیٰ اور زین العابدین کا تھوڑا جھگڑا ہو گیا ہے۔"

"کس بات پہ؟"

دونوں لڑکے ہیں، جوشیلے، کس نے کس کی گاڑی کو ٹکر ماری' یہ تو مجھے ٹھیک طرح سے پتا نہیں ہے۔ مگر نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ آپ بڑے ہیں۔ میں نے سوچا' آپ کے علم میں یہ بات لے آؤں۔"

"صحیح کیا۔ حسن علی کہ تم نے آکر مجھے بتا دیا۔ میں اِدی آمنہ کو کہتا ہوں وہ زین العابدین کو سمجھائے' اور تم بھی مرتضیٰ کو سیدھا کرو' ابھی تک ویسا ہی لاابالی اور غیر ذمہ دار ہے۔ اب ذمے داری ڈالو اس پر' بچہ بنا پھرتا ہے' لوفروں سے دوستی چھڑاؤ۔"

"اوا! اب تو کافی ذمہ دار بن گیا ہے' زمینوں پر بھی جاتا ہے۔" وہ ڈھیلا پڑ گیا۔

"یہ تو تم کہتے ہو نا! جب دنیا کہے تو مانوں۔ تعلیم کے ساتھ تو ویسے بھی اس کی نہیں بنی۔ کم از کم زمینیں تو سنبھالے' میری باتوں پر غور کرنا۔"

"حاضر اوا حاضر' جو آپ کا حکم۔ میں اور سختی کروں گا اس پر' مگر آپ بھی خیال رکھیے گا' خاندان میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں' آپ یقیناً اس سے لاعلم نہیں ہوں گے' اوپر سے نور العارفین کی آمد۔"

اس نے جان بوجھ کر بات بیچ میں چھوڑ کر سر جھکا لیا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو' حسن علی! میں تمہیں زبان دے چکا ہوں' سندھیا کل بھی تمہاری تھی' آج بھی تمہاری ہے' اِدی آمنہ آئی ہے تو میں اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے تو نہیں نکال سکتا' ہاں جواب ہر بار دیتا ہوں۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں بات ختم کی۔

"ہاں اوا' اِدی آمنہ کو تو لاکھ بار آفرین ہو' وہ ہم میں جدائی ڈلوانے آئی ہے' بالکل ناجائز بات کرتی ہے۔" اس نے غصے سے کہا۔

"بس اس کا بھی قصور نہیں۔ اولاد کے آگے والدین مجبور ہو جاتے ہیں' تم بھی تو اپنے بیٹے کے کرتوتوں کے آگے مجبور ہو نا۔" اعجاز نبی شاہ متانت سے کہا تو حسن علی نے سر جھکا لیا۔

☼ ☼ ☼

"زین العابدین! یہ شرافت نہیں ہے کہ تم لوگ سر بازار ایک دوسرے کو گریبانوں سے پکڑو۔" بی بی آمنہ نے سخت رنجیدہ تھیں۔

"اماں! میں تو اسے سائڈ دے رہا تھا' اس نے جان بوجھ کر گاڑی ٹکرائی ہے' جب سے بھائی آیا ہے' تب سے اس کا دماغ پھرا ہوا ہے' کئی بار میں کنی کترا کے گزر جاتا ہوں۔"

"پھر بھی بیٹا! تمہیں یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ اسے گھونسے رسید کرو۔"

"اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر گاڑی سے اتارا تھا' پھر میں اس کو چھوڑ دیتا؟ وہ نواب زادہ ہے کیا؟"

"شرم کرو' میرے بھائی کا نام کیوں لا رہے ہو؟"

"اماں کیا کہا ہے میں نے آپ کے بھائی کو۔ نواب کہا ہے گالی تو نہیں دی۔" وہ تلملایا۔

"چپ ہو جاؤ زین العابدین! اماں سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" نور العارفین نے اسے ڈانٹا۔

گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی' اور جیجی اتر رہی تھیں' وہ برآمدے سے تیز تیز چلتا ہوا باہر آیا۔ کھڑے جیجی کو اتارنے میں مدد دیتے انوار نبی سے ملا' اور پھر جیجی کے ہاتھ چومنے لگا۔

"میرا بچہ اللہ تمہیں خوش رکھے' آباد رکھے۔" جیجی اس کا چہرہ چومتے دعائیں دینے لگیں۔

"جیجی! اتنے دنوں کے بعد میرے گھر آئی ہو۔" بی بی آمنہ نے انہیں ہاتھ سے تھام کر صحن میں پڑی کرسی پر بٹھایا۔

"چلیں جیجی' اوا نور العارفین کے بہانے آپ ہمارے غریب خانے پر تو آئیں۔" زین نیچے بیٹھ کر اس کی ٹانگیں ہلکے سے دبانے لگا۔

"تم کبھی نہیں بدلو گے' زین العابدین؟" جیجی

متبسم ہوئیں۔

"ہاں جیجی! یہ کبھی نہیں سدھرے گا' بیٹے کا باپ بن گیا ہے' پھر بھی۔" نور العارفین نے اس کے ایک سال کے بیٹے کو ہاتھوں سے اچھالتے ہوئے کہا۔

"بابے ادھر آ۔" زین العابدین نے بیٹا اٹھا کر جیجی کے سامنے کیا۔ "ہاتھ ملا جیجی سے' ہاتھ کو چوم۔" اس نے جیجی کا ہاتھ بچے کے منہ پر رکھا' وہ منہ بسورنے لگا۔ "گندے میرے ہاتھ چوم جیجی کا۔"

جیجی نے ہلکی سی چپت اس کے سر پر رسید کی اور اس کے بیٹے کو گود میں لے کر پیار کرنے لگیں۔

"دلہن! اب اسے اٹھاؤ' مجھے بھگو دے گا۔"

"یہ موئی آپ کو ابھی تک دلہن لگتی ہے' ایمان سے مجھے تو بھینس لگتی ہے۔" اس نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کہا۔

"اچھا۔ مجھے تو اب اندر لے چلو مغرب کا ٹائم ہو رہا ہے۔" جیجی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ پچھتر سالہ بوڑھی جیجی کو ہاتھ سے پکڑ کر اندر کی طرف بڑھا۔

"آئیے جیجی آئیے' آپ کے لیے تخت طاؤس' تخت سلیمان' تخت سبا' تخت امی حاضر ہے۔"

بس کرو زین! حیا کرو' جیجی کے ساتھ اتنا مذاق۔" بی بی آمنہ اپنی وضع دار طبیعت سے مجبور اسے ٹوک بیٹھیں۔

"جیجی! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔" اس نے فوراً ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

"ارے نہیں بابا! تم سب بچے ہو میرے' اب تم بھی جاؤ' نور العارفین کب کا نکل گیا' نماز کے لیے۔"

ماں کے کہنے پر اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا' وہ مغرب پڑھ کر آیا تو برآمدے میں صرف جیجی نماز پڑھ رہی تھیں۔

جیجی کی نماز ہمیشہ کی طرح بہت لمبی تھی' وہ بہت آہستہ آہستہ نماز پڑھتی تھیں' وہ بغور جیجی کو دیکھنے لگا اور اس کو بے طرح سندھیا یاد آئی' اس کے دل کی جگہ درد بھر گیا' اس کے دل میں اس کو دیکھنے کی تمنا قطرے سے سمندر بن گئی اور اس کا سارا وجود اس سمندر میں ڈوبنے لگا' اس کا دل اپنی دھڑکنیں کہیں اور گم کر رہا تھا' اسے اپنی دھڑکنیں بہت معدوم محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اس کے تخیل میں مجسم تصویر بنی کھڑی تھی' اس کے بہت قریب تھا' بیچ میں صرف اک دیوار حائل تھی' مگر اسے لگا کہ وہ سینکڑوں میل دور طائف کے باغات میں چہل قدمی کر رہا ہے' اور شاہ لطیف کی نگری سندھ دھرتی سے آنے والی ہوائیں' سندھیا کی یاد لیے چلی آ رہی ہیں۔ وہ قریب ہو کر بھی اس سے اتنا ہی دور ہے۔

جیجی کے ہاتھ دعا کے لیے بلند ہو گئے' وہ اسی بےخودی کے عالم میں جیجی کی طرف بڑھا' اور سر ان کے زانوں پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

"جیجی! دعا کریں میرے لیے۔" اور جیجی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

بھلا محبت بھرے قلوب کے لیے کیا دعا کی جائے' جیجی سوچ میں پڑ گئیں' کیا وصل کی؟ خاندانی اتفاق پہ' یہ بہت بڑا وار تھا۔

"محبت کے ختم ہونے کی؟ محبت تو پہلے ہی ناپید ہے' جو رہ گئی ہے' وہ کیوں ختم ہو' صبر کی' یا قرار کی؟" وہ سوچتی ہی رہیں۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا' مرتضیٰ ان کا بھتیجا' عارفین ان کا بھانجا۔

"یا اللہ! تو عالم الغیوب ہے' ان سب کے حق میں جو بہتر ہو' وہ کر دے' اور سب کو اس پر صبر کی توفیق عطا فرما۔" انہوں نے درود پڑھ کر دونوں ہاتھ منہ پر پھیرتے' اور عارفین کا سر سہلانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

کتنے دن ہو گئے تھے اسے آئے ہوئے مگر وہ ادھر نہ اور نہ ہی وہ ادھر جا سکتی تھی' اک امید تھی کہ شاید جیجی سے ملنے آئے تو اس کی اک جھلک ہی دیکھ لے' مگر وہ بابا جان نے منع کر دیا۔ جیجی خود گئی تھیں اس سے ملنے' اور اس کی بے قراری میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا تھا' رات کو جیجی کے آنے کے بعد وہ ان ہی کے پاس بیٹھی رہی' شاید جیجی اس کا کوئی تذکرہ کریں' مگر جیجی نے کتنی

ہی دیر کوئی ذکر ہی نہ کیا۔ اس کی کیفیت ان دونوں۔

یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے

کے مصداق ہو گئی تھی اور شاید جیجی اس کی ان کہی بات سمجھ گئی تھیں۔

"آمنہ کے سارے ہی بچے بڑے فرماں بردار ہیں' اللہ سب کو خوش رکھے' نور العارفین کچھ کمزور ہو گیا ہے' پوچھا تو کہا جیجی! کچھ عرصہ بیمار رہا ہوں اس لیے۔" جیجی نے نور العارفین کی بے تابی اس تک پہنچا دی تھی۔



اس بات کے بعد بہت دن گزر گئے تھے اور اس کی بے تابی سوا تھی' دعا کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا' خاندان کا معاملہ تھا' ہاں اگر بابا جان راضی ہو جاتے تو کوئی رکاوٹ نہ بنتا۔

اور تب اس نے اپنے گھٹنے مصلے پر گاڑ دیے تھے' اور اپنے ہاتھ دعا کے دامن پر ٹانک دیے تھے' صدق دل سے مانگی ہوئی دعاؤں سے معجزات رونما ہوا ہی کرتے ہیں' وہ بھی معجزے کی منتظر تھی۔



ماروی اسے خوش خبری سنانے آئی تھی کہ اس کا ٹرانسفر ملیاری ہو گیا ہے' مگر سندھیا کی حالت دیکھ کر اسے اپنی بات یاد ہی نہ رہی تھی اور وہ ہمدرد اور غم گسار دوست پا کر پھر سے رونے لگی تھی۔

"ماروی! میں نے اتنی کوشش کی ہے' اسے دل سے نکالنے کی مگر میری ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے۔"

وہ اس کی بات سن کر مسکرا دی۔ "بی بی سندھیا! میری دوست گل ہمیشہ کہتی ہے' جانتی ہو ہماری سندھی قوم کا المیہ کیا ہے' ہمارے دلوں میں جس کی محبت بیٹھ جائے' تو پھر نکلتی نہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں' ہاں یہ ہے کہ ہم وقتی طور پر بددل ہو جاتے ہیں مگر محبت کو جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکتے' ہم مجبور ہیں اپنی اس فطرت کے آگے' اکھاڑ کر پھینکنا چاہیں' پھر بھی نہیں پھینک سکتے اس نامراد محبت کو ہم اپنے لیڈروں سے بھی ایسی ہی محبت کرتے ہیں۔"

"نہیں ماروی! محبت نامراد نہیں ہوتی۔" اس نے قطعیت سے حتمی لہجے میں کہا۔ "ہاں۔ کبھی ہمیں یہ لگتا ہے کہ یہ نامراد ہے' یا ہمیں کر رہی ہے' کیونکہ ہماری ساری مرادیں محبوب کی ذات سے وابستہ ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہمیں پر نم کرتا ہے' پھر پر درد کرتی ہے اور پھر دائمی سکون سے نوازتی ہے۔" بات پوری ہونے تک اس کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔

امیدان کو چائے دے کر چلی گئی تھی۔

"میں نے بہت سارے محبت کرنے والے دیکھے ہیں سندھیا شاہ! مگر محبت کی اتنی خوب صورت شکل کہیں اور نہیں دیکھی' تم سندھیا! تم موم کی طرح پگھل رہی ہو اس محبت میں۔"

"نہیں ماروی! محبت بے حد خوب صورت' انسانوں کی بد صورتی اس پہ اثر انداز نہیں ہوتی' بہت کم شکل لوگ محبت کرتے ہیں تو محبت ان کو بھی خوب صورت بنا دیتی ہے۔" وہ بہت آہستہ سے مسکرائی تھی۔

"ہر بندہ اپنے ظرف کے مطابق محبت کرتا ہے' اور ہر ایک کے دل کی وسعت بھی ایک سی نہیں ہوتی' کوئی قطرے کا طالب ہوتا ہے' کوئی دریا کا تو کوئی سمندر کا' کوئی محبت کو دیکھتا ہے' کوئی محسوس کرتا ہے' کوئی چھوتا ہے اور کوئی اوڑھ لیتا ہے۔"

اس کے گلے میں پھندا سا اٹک گیا' ماروی یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی' اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ بہت ہی دلکش تھا' اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"اور ہر ایک کی محبت کا وقت بھی ایک سا نہیں رہتا' کسی کی دنوں میں ختم ہو جاتی ہے' کسی کی ہفتوں میں' کسی کی مہینوں میں تو۔۔۔ کسی کی پوری عمر محبت میں بدل جاتی ہے۔" ماروی نے سندھیا شاہ کے کھوئے کھوئے سے وجود کو دیکھا' بڑی توجہ سے' بڑی محبت سے۔

"پتا ہے ماروی! محبت نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر جینا سکھایا ہے' محبت نے مجھے بتایا ہے کہ زندگی کا حسن کیا ہے' محبت نے مجھے تخیل کی رفاقت دی' حسن کا معیار کیا ہے' محبت نے مجھے اپنے تحیر میں گم کر دیا ہے' محبت نے مجھے خوابوں سے آشنائی دی ہے' محسوسات کی انوکھی دنیا کی سیر کرائی ہے' محبت نے مجھے بات بات پر پوشیدگی اور سحر سے آگاہی دی ہے' محبت کے میری ذات پر بہت سارے احسانات ہیں' میں چاہوں بھی تو اب اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ بابا جان چاہتے ہیں کہ مجھ پر مرتضیٰ کا ٹھپا لگا دیں' ان کی مرضی میں خود کو ان کی رضا پہ قربان کر دوں گی' مگر ماروی! میری روح اور میرے دل پر صرف اور صرف محبت کی مہر لگی ہوئی ہے۔ بابا جان کی مرضی مجھے کسی کے بھی حوالے کر دیں' کسی کے بھی؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور ماروی کے پاس ایک بھی ایسا لفظ نہیں تھا' جو اس کو دلاسا دیتا' اس نے خاموشی سے اٹھ کر اس کو گرم جوشی سے بازوؤں میں بھرا تھا' اور اپنا شانہ پیش کر دیا تھا' اچھا دوست' محبت کرنے والا دل' خدا کی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔



مرتضیٰ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ کہاں گیا۔ کسی کو علم نہیں تھا' اس کے دوست جاننے والے' سب لاعلم تھے' تین دن ہو گئے تھے اور ابھی تک کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

حسن علی شاہ اس کو ڈھونڈ کر تھکا تو اعجاز نبی شاہ کے پاس گیا۔

"ادا! یہ شرارت لوی آمنہ کے بیٹوں نے کی ہے۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو حسن علی؟" اعجاز نبی شاہ نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"ادا! میں حلف اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ کام ان ہی لوگوں کا ہے' میری یا مرتضیٰ کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔ وہ میرے مرتضیٰ کو راستے سے ہٹانا چاہ رہے ہیں۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ ان کے خلاف پرچہ کٹوا رہا ہوں۔"

"حسن علی! ابھی پرچہ نہ کٹواؤ' میں نور العارفین کو بلوا کر اس سے پوچھتی ہوں۔" جیجی نے مداخلت کی۔

"جیجی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بھلا چور کیسے کہے گا کہ ہاں میں نے چوری کی ہے۔ قاتل قتل کر کے بھی بھلا مانتا ہے۔" اس نے طیش سے کہا۔

"ٹھیک ہے' حسن علی! تم جو کرنا چاہتے ہو کرو' آخر تمہارے بھی بیٹے کا معاملہ ہے' اور جیجی پوچھ لینا چاہتی ہے' تو اسے بھی پوچھ لینے دو' تاکہ کل کو ادی آمنہ ہمیں یہ نہ کہے کہ آپ لوگوں نے مجھے نہیں بتایا۔"

"ٹھیک ہے ادا! پر آپ لوگ مجھ سے لکھوا لیں۔ یہ کام ان ہی دو بھائیوں کا ہے۔"

شام کو ان کے آنے سے پہلے ہی اس کی ماں نے اس کو باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا' نور العارفین کے آنے کے بعد صحن کی آخری سائڈ پر جانے کی تو پہلے ہی پابندی تھی' دیوار کی کھڑکی پر بھی تالا لگوا دیا گیا تھا' اور آج کمرے سے نکلنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی' وہ تو پہلے ہی پریشان تھی' چاچا کی نور العارفین کے خلاف ایف آئی آر درج کروانے کا سن کر۔ یہ خبر وہ ان کو کیسے سنائے' پھوپھو جان کو ہی بتا دے' مگر سب کے سامنے کیسے؟ کاش پھوپھو مجھ سے ملنے کمرے میں آ جائیں' وہ سوچتی رہی۔ فون تو وہ کر ہی نہیں سکتی تھی' جہاں کرتی وہاں پہلے سب کو بتانا پڑتا تھا' اس کی ماں خود اس کو دوستوں کے نمبر ملا کر دیتی تھی' تب سے جب اک بار نور العارفین نے اسے گھر پہ فون کیا تھا' اور اتفاق سے اس نے ہی اٹینڈ کیا' اس کی آواز سن کر وہ بوکھلا گئی تھی' سب لوگ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے' اس نے گھبرا کر فون رکھ دیا تھا' اور تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گئی تھی' یہ ساری غلطی وہ بے اختیاری میں کر بیٹھی تھی۔

انوار نبی نے اٹھ کر نمبر چیک کیا تو سعودی عرب کا تھا' فوراً بی بی آمنہ کو بلوا کر شکایت کی گئی تھی کہ یہ شریفوں کے اطوار نہیں' اسی وقت نور العارفین کو فون کر کے بی بی آمنہ نے سختی سے ڈانٹا تھا' مگر اس کا کہنا تھا

کہ مجھے انوار نبی سے کام تھا، اس لیے فون کیا، تب اسے کہہ دیا گیا کہ اوطاق کے نمبر پر فون کرے گھر میں نہیں۔

مگر سندھیا پر فون کو ہاتھ تک لگانے کی پابندی عائد کر دی گئی۔

اسے واحد یہی حل سمجھ میں آیا کہ وہ ماروی کو فون کرے، وہ آئے تو اس کو ساری بات بتائے کہ جا کر ان کو خبردار کرے، تاکہ وہ گرفتاری سے بچ جائیں۔

"اس وقت اندر جاؤ، وہ لوگ آ رہے ہیں، چلے جائیں تو پھر کر لینا۔" بی بی عطیہ نے اتنی نرمی سے کہا کہ وہ ضد بھی نہ کر سکی اور واپس کمرے میں آ گئی۔

"جیجی! آپ یقین کریں کہ مرتضیٰ کو میں نے اغوا نہیں کروایا۔ میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ یہ حرکت زین کی بھی نہیں، آپ جو کہیں میں وہ اعتبار دینے کو تیار ہوں، چاہیں تو مجھے مسجد میں لے چلیں، چاہیں تو قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ مجھے تو یہ بات سوچ کر ہی گھن آ رہی ہے۔"

نور العافین کی آواز اس تک لفظ بہ لفظ پہنچی تھی، اس نے دروازے کی ہلکی سی درز سے دیکھا، مگر نور العارفین شاید جیجی کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، تب ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"مگر حسن علی کا شک تم لوگوں پر ہے۔" اعجاز نبی شاہ نے بغور اسے دیکھ کر کہا۔

"ماما سائیں! آپ جو بھی قسم لیں۔ ماما حسن علی نے الزام لگایا ہے، بلکہ گالی دی ہے ہمیں، ہم میر علی شاہ کی اولاد ہیں، ہم اتنی نیچ اور گھٹیا حرکت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

مرتضیٰ تو ہمارا بھتیجا ہے، اور تم لوگ بھانجے ہو، تم سب ہمیں اولاد کی طرح عزیز ہو، نہ تم لوگوں پر آنچ تکلیف سہہ سکتے ہیں، نہ مرتضیٰ پہ، آپس کے اختلاف کو اس حد تک نہیں بڑھانا چاہیے کہ ایک دوسرے کی جانوں کے دشمن ہو جاؤ۔" جیجی نے بے حد رنج سے کہا۔

"جیجی! اگر کبھی بھی مرتضیٰ کا اغوا ہم پر ثابت ہو جائے نا تو آپ کو اجازت ہے کہ ہمیں الٹا لٹکا دیں۔"

نور العارفین نے ان کا ہاتھ چوما۔

"پھر جو چور کی سزا، وہ ہماری سزا، مگر خدارا صرف شک کی بنیاد پر ہم پر اتنا بڑا الزام نہ لگا۔ آپ لوگ کہ ہمیں اپنے وجود سے شرم آنے لگے۔" زین العابدین نے غصہ ضبط کر کے کہا۔

بی بی آمنہ خاموش ہراساں سی بیٹھی ہوئی تھیں، مگر اعجاز نبی شاہ کو ان کی باتوں پر یقین سا ہونے لگا تھا۔

اور اندر وہ پریشان ہو رہی تھی کہ ایف آئی آر کی خبر ان تک کیسے پہنچائے۔

اسی وقت حسن علی شاہ پولیس کو لے کر آیا تھا۔ ایس ایچ او باہر کھڑا تھا، وہ اندر گھسا تو اسے معلوم ہو کر وہ لوگ جیجی کے پاس ہیں، اس نے چار کانسٹیبل ان کے دروازے پر کھڑے کیے، ایس ایچ او اور سپاہیوں کے ساتھ اعجاز نبی شاہ کے دروازے پر آیا، وہاں پولیس کو باہر کھڑا کر کے وہ خود اندر داخل ہوا تھا۔

"میں ان کو گرفتار کروانے آیا ہوں۔" اس نے دونوں کو غصے سے گھور کر کہا۔

"حسن علی! تم میرے دروازے پر پولیس لے آئے ہو!" اعجاز نبی شاہ نے استعجاب سے اسے دیکھا۔

"ہوا! پہلے ان کے دروازے پر گیا تھا، پتا چلا کہ یہ تو آپ کے ہاں ہیں، سوچا۔ کہیں بھاگ نہ جائیں، سو پولیس کو آپ کے دروازے پر لے آیا ہوں۔"

"تمہیں اتنی جلدی کیا تھی حسن علی! کہ پولیس میرے دروازے پر لا کھڑا کیا ہے، مجھے بتاتے کہ میرے بیٹوں پر شک ہے تو میں اپنے دونوں بیٹوں کو ہاتھ سے پکڑ کر تمہارے حوالے کر دیتی۔"

"ہوں! شک کیا مجھے پکا (یقین) ہے، مرتضیٰ کو اغوا تمہارے بیٹوں نے ہی کروایا ہے، اور میں نے [illegible] ہی یہ قدم اٹھایا ہے۔" اس نے تیش سے کہا۔

"آفرین ہے حسن علی! آفرین ہے! میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ پولیس لا کر حویلی کے دروازے پہ کھڑی کر دو۔" اعجاز نبی شاہ نے غصے اور رنج کی ملی جلی کیفیت سے اسے دیکھا۔

ہوا! میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے، تین دنوں سے میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا، کھانا آگے رکھتا ہوں تو بھوک اڑ جاتی ہے کہ پتا نہیں مرتضیٰ نے کچھ کھایا پیا ہوگا کہ نہیں، پتا نہیں وہ کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے کہ نہیں۔" اس نے آبدیدہ ہو کر بات ادھوری چھوڑی۔

"اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" جیجی نے دعا کی۔

"سب کی خیر۔ بجز دشمن کی خیر۔" بی بی آمنہ بڑبڑائیں۔

سندھیا سے رہا نہیں گیا، وہ ماں کی ساری تاکید بھلا کر کمرے سے باہر نکل آئی، اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار واضح تھے۔

نور العارفین جواب تک غصہ ضبط کیے کھڑا تھا۔ اتنی پریشانی اور ٹینشن میں بھی اس کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی تھی اور سندھیا نے جواباً اسے جن نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر حسن علی شاہ جو پہلے تو سکتے میں آیا تھا پھر اسے طیش آ گیا۔

نور العارفین یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا، کتنی بڑی مصیبت آئی کھڑی تھی، کتنا بڑا الزام لگ چکا تھا۔ مگر وہ ساری پریشانی سندھیا کو ایک نظر دیکھتے ہی زائل ہو گئی تھی۔

ماں کے گھورنے پر گھبرا کر وہ واپس کمرے میں چلی گئی تھی۔

ان چند لمحوں نے سب کو خاموش کر دیا تھا۔

"ویسے کہنے کو ہم بھی کہہ سکتے ہیں، ماما نے آپ کے ساتھ مل کر ہمیں گرفتار کروانے کی سازش کی ہے، مگر ہم ایسا نہیں کہیں گے کہ یہ ویسا ہی الزام ہوگا جیسا اس وقت آپ نے ہم پر لگایا ہے۔" زین العابدین نے بہت مضبوط اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب تم لوگ نکلتے ہو باہر یا پولیس کو لے آؤں۔" حسن علی چیخا۔

"آپ سے یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے۔ چلو زین!" نور العارفین اسے لے کر بیرونی گیٹ کی طرف بڑھا۔ ہر فرد اپنی جگہ پریشان اور مضطرب تھا۔ کیا ہو گیا تھا ان کے خاندان کو اور وہ لوگ کس ذلت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"تم نے جلدی کی حسن علی! پہلے ہمیں ان سے بات تو کرنے دیتے۔" جیجی مضطرب ہوئیں۔

"جیجی! آپ تو ہیں ہی دھرا (فریق) ان کی ہی سائیڈ لیں گی، سرے کی طرح آپ کی آنکھوں میں پڑے ہوئے ہیں بھانجے۔"

وہ کہتے ہوئے نور العارفین کے پیچھے نکل گیا۔

✲ ✲ ✲

پندرہ دن ہو گئے تھے، اور ان کی ضمانت ہی منظور نہیں ہو رہی تھی، حسن علی نے کورٹ میں درخواست دے رکھی تھی کہ ضمانت کی صورت میں نور العارفین سعودی عرب واپس چلا جائے گا۔ اس کی ضمانت میں بہت ساری پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ عدالت نے ان کو دوسری بار پانچ دن کے ریمانڈ پر بھیج دیا تھا۔

مرتضیٰ کی کوئی خبر ابھی تک نہیں ملی تھی، خاندان کا ہر فرد اپنی جگہ پریشان تھا۔

سندھیا کی آنکھوں سے نیند مکمل طور پر روٹھ گئی تھی، ساری رات وہ دعائیں اور نوافل پڑھتی رہتی، کسی کسی وقت روتے روتے ہلکی سی آنکھ لگ جاتی پھر اٹھتی تو یہی خیال آتا اور آنکھیں بھر آتیں۔

اس کا کھانا پینا برائے نام رہ گیا تھا۔ بی بی عطیہ اس کی روز بروز بگڑتی حالت سے پریشان ہو گئی تھیں، اوپر سے چہ میگوئیاں ان کو اندر ہی اندر کھلا رہی تھیں۔ کتنی بڑی ذلت تھی کہ بی بی آمنہ کے بیٹوں نے سندھیا کے منگیتر کو راستے سے ہٹانے کے لیے اغوا کر لیا ہے اور سندھیا نور العارفین کی گرفتاری کے غم میں بیمار ہو گئی ہے۔

برادری کی وہ عورتیں جو مہینوں بعد کہیں ملتی تھیں، وہ بھی ان تینوں گھروں کے چکر لگا کر سن گن لینے آتیں، تینوں گھر بظاہر سب کی ہمدردی کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ مگر در پردہ تماشا بن گئے تھے۔ دوسری

طرف بی بی آمنہ تھیں' جو منہ چھپائے روتی رہتیں' کس کو دوش دیں' بیٹے کو' بھتیجی کو' یا محبت کو۔ وہ جیجی کے پاس جاتی تو وہ سندھیا کو لپٹا کر ڈھیروں پیار کرتیں۔

"جیجی! بچی کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔"

جیجی آہ بھر کے کہتیں "اٹھ جھنڈی پریت رت جی رتی۔ (اونٹ جتنی چاہت دوسری طرف لہو کا قطرہ یعنی خونی رشتہ۔) کیا کروں؟ میں تو تینوں طرف ہی پھنسی ہوئی ہوں۔ ایک طرف آگ ہے' دوسری طرف پانی' ادھر سندھیا کی حالت نہیں دیکھی جاتی' ادھر پتا نہیں مرتضیٰ کے ساتھ کیا ہوا' کون لے گئے' کدھر گیا' کچھ علم نہیں' پھر اتنا بڑا الزام تمہارے بچوں پر آگیا' وہ پولیس کی مار کھا رہے ہیں' پتا نہیں پولیس نے کیا حشر کیا ہو گا ان کا۔" وہ رو پڑتیں۔

ان کے پاس آتی سندھیا کو لگا کہ اس کا کلیجہ منہ کو آرہا ہے' ماروی نے جتایا تھا کہ اس پہ ذرہ بھر تشدد بھی نہیں ہوا۔ بس یہ کہ ضمانت نہیں ہو رہی' وہ فق چہرہ لیے الٹے قدموں واپس پلٹی تھی' اور اوندھے منہ پلنگ پر پڑی روتی رہی تھی۔

"وہ اسے تھپڑ مارتے ہوں گے۔" وہ اپنے گال سہلانے لگی۔ ہیجانی انداز میں اٹھ کر اپنے شانوں کو دبانے لگی' اس کے گال جل رہے تھے' کاندھے درد سے بوجھل ہو رہے تھے۔ اس کا ہر اک عضو درد کر رہا تھا' ہر جوڑ دکھ رہا تھا۔ وہ ہر اک تکلیف اپنی ذات پر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے پہلے بھی چند بار یہ بات محسوس کی تھی اور ماروی کو بتائی بھی تھی۔

اس نے ہنس کر کہا تھا "یہ تمہارا وہم ہے' میں خود تھانے میں اس سے مل کر آرہی ہوں۔ وہ بالکل آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔ بس ضمانت میں کچھ قانونی رکاوٹیں آڑے آرہی ہیں' مگر وکیل کہہ رہا تھا' وہ بھی چند دن میں ہو جائے گی۔" اس کا لہجہ اتنا حتمی اور پر یقین تھا کہ اس کو اس کی بات پر اعتبار کرنا ہی پڑا تھا۔

بی بی عطیہ نماز پڑھ کر جیجی کے پاس جا رہی تھیں' پھر واپس پلٹی تھیں' پتا نہیں اس نے کھانا بھی کھایا یا نہیں' یا اللہ! میری بچی پر رحم کر' اسے ہدایت دے۔" وہ زیر لب دعائیں مانگتی اندر داخل ہوئیں' تڑے مڑے سی ہی پڑی تھی' اور رو رو بلک رہی تھی۔

"کیا ہوا سندھیا' کیا ہوا؟" وہ اس کی حالت گھبرا گئیں۔

"اماں!" اس نے روتے' بلکتے بچوں کی طرح گردن میں باہیں ڈال دی تھیں۔

"اماں! بابا جان کو کہو' نور العارفین کو چھڑ میں مر جاؤں گی اماں! میرا ہر عضو دکھ رہا ہے' میرا جسم درد بن گیا ہے' خدا کے لیے اماں خدا کے لیے کہو' ہاتھ جوڑ کے' پاؤں پکڑ کے۔" وہ بے زار روتے ہوئے بولی۔

اور بی بی عطیہ کو اس پر غصہ نہیں آیا' غیرت نہ آئی' بے تحاشا ترس آیا۔ آج سے پہلے اس نے نہیں کھولی تھی' انہوں نے اسے بارہا ڈانٹا' وہ سن لیتی' انہیں جواب نہیں دیتی۔ اقرار کرتی نہ مگر آج وہ ہاتھ جوڑ کر ان سے اقرار کر بیٹھی تھی۔

وہ بیٹی کی اس شدت پر خود بھی رو پڑیں۔

"مت رو' میری جان! میں آج ہی تمہارے بات کرتی ہوں۔"

رات کو وہ سر جھکائے اعجاز نبی شاہ کے سامنے تھیں۔

"سائیں! میری بچی مر جائے گی' خدا کے واسطے نور العارفین کی ضمانت کروائیں۔ سائیں! مجھ سے سندھیا کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔"

اعجاز نبی شاہ نے اپنے آگے ہاتھ جوڑے بیگم کو دیکھا' جو سندھیا کی وجہ سے یہ زہر کے گھونٹ بھرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔

اور اس وقت وہ خاموش رہ گئے' انہوں نے نہیں ڈانٹا' اس کی تربیت سے نقص نہیں نکالا' انہیں سندھیا پر بھی غصہ نہیں آیا' غیرت نے کے اندر ہمیشہ کی طرح جوش نہیں مارا۔ انہوں نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلا کر جھکا لیا۔

انہیں پہلی بار پتا چلا تھا کہ بیٹیوں کے باپوں کے سر کیوں جھکتے ہیں' غیرت سے نہیں شاید محبت

لوٹ کر سندھیا کے پاس آئیں۔

"میں نے کہہ دیا ہے' تمہارے باپ کو اور اس نے خاموشی سے سر اثبات میں ہلایا ہے۔"

اسے یہ بات سن کر بے تحاشا شرم آئی' بابا جان نے کیا سوچا ہوگا' میرے بارے میں' یہ میرا دل' اس نے مجھے کتنا مجبور اور ذلیل کر دیا ہے' وہ اک بار پھر آب دیدہ ہوگئی۔

٭ ٭ ٭

"تم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے' اسے تھانے میں کوئی تکلیف نہیں۔ تم نے کہا تھا کہ ایس ایچ او سے اس کی دوستی ہے' اور ریمانڈ میں اس سے صرف زبانی تفتیش ہو رہی ہے' بولو' تم نے یہ سب کہا تھا نا؟" ماروی اس کے کتنے فون کرنے کے بعد اس سے ملنے آئی تھی' اس لیے کہ اس کا جھوٹ پکڑا جا چکا تھا' اور اب وہ سندھیا کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔

نورالعارفین کی گرفتاری کے بعد وہ کتنے ہی جھوٹ گڑھ کے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتی' مگر اس کا ورد اور بڑھ جاتا تھا۔

"بولو ماروی! تم نے کہا تھا نا مجھ سے' کیوں جھوٹ بولا مجھ سے؟" وہ نم آنکھوں سے بازو سے پکڑے اس کو جھنجوڑ رہی تھی۔

"تم گئی تھیں نا اس کو دیکھنے تھانے؟" وہ رو دی' اور اس کے تصور میں نورالعارفین کا پھٹا ہوا ہونٹ آ گیا۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ بالکل فریش ہے' گلاب کی طرح تر و تازہ' ہاں بس تھوڑی سی شیو بڑھ گئی ہے۔ اور ۔۔۔ اور وہ اس میں پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہا ہے۔" آنسو تواتر سے اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

اس کی دائیں آنکھ کے نیچے چہرے پر شدید چوٹ کا سرخ نشان اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

اس نے اتنے زخموں کے باوجود اس کو کس طرح مسکرا کر دیکھا تھا۔

وہ اس سے ملاقات کر کے لوٹی تو بہت پریشان ہوگئی۔ سندھیا کا سامنا کیسے کرے گی۔ جب اس نے اپنے اندر اس کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیا' تو اس نے ڈرائیور کو اپنے اور سندھیا کے لیے آئس کریم لینے بھیجا' وہ بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔

جس جھوٹ کو بولنے کی پریکٹس وہ کتنی ہی بار کر کے آئی تھی' وہ بولنا اس کو سخت مشکل لگا' اس نے آتے ہی آئس کریم پگھل جائے گی کا شور مچا دیا۔

"میں کھاتی ہوں' مگر مجھے پہلے اس کے بارے میں بتاؤ؟"

تب اس نے نظریں نیچی کیے آئس کریم کھاتے سارے گھڑے ہوئے جھوٹ اسے بتا دیے۔ اس کے سارے جھوٹ کھل چکے تھے۔ اور وہ مجرم بنی اس کے پاس بیٹھی تھی' اور وہ پگھل رہی تھی' رو رہی تھی۔

"بولو نا ماروی! کیوں بولا تم نے مجھ سے جھوٹ؟"

وہ گھٹی گھٹی سسکیاں لینے لگی۔

"اور کیا کرتی؟" اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ "تمہیں حقیقت بتانا زندہ درگور کرنے کے مترادف تھا' اور مجھے نورالعارفین نے منع کر دیا تھا' تمہیں کچھ بتانے سے۔" اس نے لب بھینچ کر آنسو پینے کی کوشش کی۔ "اس نے مجھ سے کہا تھا' محبت ان عذابوں سے بڑھ کر طاقت ور ہے' جو میں سہہ رہا ہوں۔"

"مجھے سب سچ سچ بتاؤ ماروی خدا کے لیے۔"

"ہاں' اس کے چہرے پر' جسم پر زخموں کے نشان تھے' اس کا منہ سوجا ہوا تھا' وہ جب بات کرنے آیا تو لڑ کھڑا رہا تھا۔ سلاخوں کے پیچھے وہ بہت عزم سے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے مسکرایا تھا' رت جگے کا پتا دیتی اس کی آنکھیں محبت کی قوت سے چمک رہی تھیں' اس نے کہا سندھیا کی محبت نے مجھے حالات سے نبرد آزما ہونے کی قوت بخشی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ سے خود کلامی کے سے انداز میں سب کچھ اس کے سامنے اگل رہی تھی' اک خواب ناک کیفیت میں اس کو بتاتی رہی اور وہ دم سادھے لب کاٹتے سنتی گئی۔

پتا نہیں کیوں محبت انسان کا رشتہ آنسوؤں سے جوڑ دیتی ہے۔ اس نے لب سی لیے' اور آنسو اس کی محبت کے گواہ' اس کے رخساروں پر گولائی کی مہریں ثبت کرتے رہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے دونوں بہنوئی ضمانت کروانے کی مسلسل کوششوں میں کامیاب ہوگئے تھے' جبکہ زین کی ضمانت کچھ دن پہلے ہی ہوگئی تھی۔ وہ آرام کر رہا تھا' اس کی ٹانگ میں بہت شدید چوٹ لگائی گئی تھی' جس کی وجہ سے ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوگئی تھی۔

عدالت میں نورالعارفین کا پاسپورٹ شناختی کارڈ جمع کروا دیا گیا تھا۔ اس کی ضمانت میں اعجاز نبی شاہ کا اثر و رسوخ بھی کام آیا تھا۔ ٹھیک تین ماہ بعد وہ آزاد ہو کر گھر پہنچا تھا۔ اس کی ماں اس کے غم میں رو رو کر بیمار پڑ گئی تھی۔ وہ ماں کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"اماں! سندھیا کیسی ہے؟" بی بی آمنہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

"ویسی ہی ہے بیٹا! جیسے تم ہو' وہ ہم سے الگ تھوڑی ہے' ہمارے ساتھ ہی تکلیف میں رہی ہے' ویسی ہی بدنامی' ویسی ہی تکلیف' ویسی ہی ذلت' اس نے بھی اٹھائی ہے' جیسی ہم نے۔"

اس کے ہونٹوں پر بہت اداس مسکراہٹ تیر گئی۔

"اللہ تمہارے دل کی مراد پوری کرے بیٹا!"

"آمین ۔۔۔ اماں آمین!" اس نے بے ساختگی سے ماں کے ہاتھ چوم کے آنکھوں سے لگائے تھے۔

"اللہ کرے مرتضیٰ بھی خیریت سے ہو۔ پتا نہیں کہاں ہے؟ کس حال میں' میرے بھائی کا بیٹا ہے' اللہ تعالیٰ میرے بھائی کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے' آمین۔"

"ہاں۔ خدا کرے وہ واپس آ جائے' اور ہم اس الزام سے بری ہو جائیں' اماں آپ یقین کریں' ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے' ماما نے خواہ مخواہ ہی ہم کو ذلیل کیا ہے۔"

"مجھے یقین ہے' میرے بیٹے کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتے۔" انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر مان سے کہا۔

ماروی نے فون کر کے اسے آزادی کی مبارک باد دی تھی۔ اور کہا تھا کہ وہ کوشش کرے گی کہ سندھیا سے اس کی بات کرا دے۔ وہ اک اک گھڑی گن رہا تھا' کب ماروی آفس سے فارغ ہو کر رات کو سندھیا کے پاس جائے گی' اور اپنے موبائل سے بات کروائے گی۔ اس خوشی میں کھانا بھی اچھا نہیں لگا تھا' چند نوالے لے کر وہ اٹھ گیا۔

اندر آ کر اس نے کنڈی لگائی تھی' اور سیل اٹھا کر اس پہ نظریں جمائے بیٹھ گیا۔

وہ اس کی مسحور کن آواز سنے گا' وہ آواز جس نے پہلی باری میں ہی اس کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ جکڑ لیا تھا۔

٭ ٭ ٭

نورالعارفین آ گیا تھا۔ یہ خبر اس وقت اتنی اہم تھی' اس کے لیے' کہ باقی ساری باتیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔

ماروی نے اسے فون کر کے مبارک باد دی تھی' اور کہا تھا کہ رات کو گھر آ کے کوئی خوش خبری دوں گی' وہ اس کے لیے کھانا بنوانے لگی۔ اس نے انیسہ کو دال چاول کے ساتھ شامی کباب اور پکوڑے بنانے کو کہہ دیا تھا۔

وہ آئی تو نیاری کی مشہور آئس کریم اور ملوا لے کر آئی' سندھیا کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ آئی تھی۔

"کیسی ہو؟" وہ اس کے گلے لگی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بہت دنوں بعد کھل کے مسکرائی۔

"تم یہ نکالو' تب تک میں جیجی سے مل کے آتی ہوں۔" وہ لے شاپرز تھما کے جیجی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"السلام علیکم جیجی!" اس نے جھک کر ان کا ہاتھ

چوما۔

"وعلیکم السلام۔" انہوں نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔

"اماں اور نانی کیسی ہیں؟" جیجی نے مسکراتے ہوئے حال دریافت کیا۔

"بالکل ٹھیک ہیں جیجی! آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔ اور آپ کو بہت مبارک باد ہو' نورالعارفین کی آزادی کی۔"

"خیر مبارک' خیر مبارک' اللہ کا شکر کہ بچہ آگیا' بس اب تو رات دن یہی دعا ہے کہ مرتضیٰ خیریت سے واپس آجائے۔"

"جیجی! فکر نہ کریں' وہ بھی آجائے گا۔"

"آمین۔۔۔ آمین' اللہ والی اٹھائے۔" (بات پوری کرے۔)

"اچھا جیجی! آپ نماز پڑھیں' ہماری آئس کریم گل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' بیٹا ٹھیک ہے۔"

وہ تیزی سے سندھیا کے کمرے میں آئی اور اندر سے کنڈی لگائی' سندھیا نے اسے استعجاب سے دیکھا' مگر چپ رہی۔

"بی بی صاحبہ! آپ نے اس خوشی میں منہ میٹھا کیا۔"

وہ اس کے انتہائی مسرورانہ انداز پہ ہنس دی۔ "ہاں کرلیا۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔" اس نے بیگ سے سیل فون نکال کے کوئی نمبر ملایا' اور فون اس کی طرف بڑھا کر آنکھ ماری۔

وہ ہمیشہ سے اس کے آنکھ مارنے پر چڑتی تھی۔ مگر اس وقت بے ساختہ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی' اس نے سیل فون پکڑ لیا' وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے واش روم میں چلی گئی تھی۔ تاکہ وہ کھل کر بات کرسکے۔

اور وہ ہمہ تن گوش بن گئی' سب بھول گئی کہ اس سے کیا کہنا تھا۔ ہر وہ بات جو اس نے اس کو بتانے کے لیے دل میں سنبھال کر رکھی تھی' اس کی آواز سنتے ہی وہ سب باتیں ان دیکھے کونوں کھدروں میں چھپ گئیں' اس کے پورے وجود میں اس کی آواز کا سرشاری پھیلتی چلی گئی۔ اس نے ایک ہاتھ دل پہ رکھ لیا جیسے اسے باہر نکلنے سے روک رہی ہو' یہ خوشی تھی کہ وہ اس سے مخاطب ہے' اس سے بات کررہا ہے' اپنے ہجر کی اذیتیں بیان کررہا ہے' اس کے لیے اٹھانے والی صعوبتوں کو انتہائی معمولی تکلیف بتا رہا ہے۔ اس نے بے خودی سے آنکھیں بند کرلی تھیں' وہ اسے سنتے کسی کو دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی' مبادا! کہیں اور نہ متوجہ ہوجائے' اس کی اک اک بات اس کی یادداشت میں محفوظ ہوتی گئی۔

"کچھ تم بھی تو بولو۔"

وہ خاموش ہوگئی' ساری باتیں تو اس کی حیات دینے والی آواز سن کر ہی بھول بیٹھی تھی' اب کیا بات کرے؟

"میں تمہیں سننا چاہتا ہوں۔ سندھیا!"

اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی' شاہ سائیں کا بیت پوری کاملیت سے اس کے حافظے پہ مسکرا رہا تھا۔

چیتارے چوندیاں گالھیں' سبھی' سجنیں

جے مقابل تھیاں' تے بھو نجھو سرٖیو۔

(یاد کرکے ہر اک بات جن سے کہوں گی' سب کچھ بتاؤں گی' مگر جب اس کا سامنا ہوتا ہے' تو سب کچھ بھول جاتی ہوں۔)

اس نے دھیمے لہجے میں بیت پڑھا تھا۔ اور نورالعارفین کی خوشی سے سرشار "واہ سائیں واہ" کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ لمحہ دروازے پر کھانا لے کر کھڑی تھی' اس نے جلدی سے خدا حافظ کہہ کر فون بند کرکے واپس ماروی کے بیگ میں رکھا' اور دروازہ کھول دیا۔

ماروی واش روم سے ہاتھ لے کر نکلی تھی۔ وہ ابھی تک اس کی آواز میں گم تھی۔

"کہاں ہو جیجی! کس وادی کی سیر کررہی ہو' ابھی تک؟" ماروی نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے جھک کر شرارت سے کہا۔ اس نے ہنس کر اک مکا اس کے شانے پر رسید کیا۔

"واہ' اچھا صلہ دیا۔" وہ گنگنانے لگی' وہ بے ساختہ ہنسی' اور پلیٹوں میں کھانا نکالنے لگی۔

مگر اس کی ساری بھوک اس سے بات کرنے کی خوشی۔۔۔ اڑ گئی تھی' اس نے صرف ماروی کی خاطر چند نوالے لیے' اور ہاتھ کھینچ لیا۔

☼ ☼ ☼

مرتضیٰ خود بخود واپس آگیا تھا۔

اعجاز نبی شاہ یہ خبر سن کر مبارک باد دینے گئے تھے اور انہوں نے پوچھا تھا' کیا تمہیں کسی بھی طرح سے لگتا ہے کہ تمہارے اغوا میں نورالعارفین ملوث ہے؟"

"مجھے کچھ علم نہیں۔"

"اغوا کرنے والوں میں سے کسی کو پہچانتے ہو؟"

"نہیں میں کسی کو نہیں جانتا' وہ لوگ جہاں مجھے بٹھا کے گئے' وہاں اک بوڑھی عورت کھانا دینے آتی تھی۔ اور کبھی کبھی اک نقاب پوش آکے کہتا' یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ تمہیں گولی ماردیں گے۔ اک بار میں نے پوچھا بھی کہ آخر مجھے کیوں اغوا کیا ہے تم لوگوں نے۔ اس نقاب والے آدمی نے کہا کہ آئندہ یہ سوال ہی نہ کرنا' ورنہ تمہیں جو اتنی شرافت سے رکھا ہے' پھر نہیں رکھیں گے۔" وہ یہ بات سناتے بھی خوف زدہ تھا۔

"پھر بھی کسی پر کوئی شک' اور اتنے مہینوں بعد تمہیں خود ہی کیسے چھوڑ دیا؟" اعجاز نبی شاہ نے استفسار کیا۔

"چاچا سائیں! میرا کسی پر کوئی شک نہیں ہے' ہاں اس دن وہ نقاب والا آیا تو مجھے دیکھ کر خاموشی سے چلا گیا۔ مگر دروازہ کھول گیا' اس کے کچھ دیر بعد بوڑھی عورت آئی اور کہا' آج رات وہ لوگ دیر سے آئیں گے' کسی بڑی واردات پہ گئے ہیں' اور غلطی سے دروازہ کھلا چھوڑ گئے ہیں' تم اگر نکلنا چاہو تو بھاگ نکلو دائیں طرف جاتا اک کچی پگڈنڈی کسی گاؤں کے روڈ سے ملتی ہے' وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔"

میں نے اس سے کہا۔ "وہ واپس آکر تمہیں ماریں گے۔" تو اس نے کہا کہ "نہیں میں تو سوئی ہوئی تھی' غلطی ان کی تھی کہ مجھے جگایا بھی نہیں اور خود ہی دروازہ کھلا چھوڑ گئے' میں کہوں گی کہ وہ اس کا فائدہ لے کر بھاگ گیا' اور ویسے بھی تمہیں تو وہ غلطی سے اٹھا کر لائے تھے۔ انہیں اٹھانا تو کوئی اور بندہ تھا' تمہیں چھوڑ اس لیے نہیں رہے تھے کہ کہیں تم مخبری نہ کردو۔"

اس بوڑھی عورت نے مجھے دو سو روپے بھی دیے اور کہا' خبردار کسی سے اس علاقے کا پتا نہ پوچھنا' بس کوئی بھی سواری ملے تو اسے اپنے علاقے کا پتا دینا' پھر میں نے ایسے ہی کیا چاچا سائیں!"

اعجاز نبی شاہ نے غور سے اسے دیکھا' وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور سانولا نظر آرہا تھا' جو بھی بتا رہا تھا' اس سے کسی پر بھی شک ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

"میرے خیال میں اسے واقعی نورالعارفین نے اغوا نہیں کرایا۔"

"اوا! کروا بھی تو سکتا ہے' اب وہ ظاہر تھوڑی ہوگا۔"

"حسن علی! شک کی بنیاد پہ وہ بہت سزا کاٹ چکے' بغیر کسی ثبوت کے تم کیس کو جاری نہیں رکھ سکتے' تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ کیس واپس لے لو' ورنہ وہ لوگ بھی جھوٹے کیس کرنے کے الزام میں تم کو گرفتار کرواسکتے ہیں' کب تک دونوں عدالتوں کی پیشیاں بھرتے رہوگے' کل ہی وکیل سے مل کر بات کرو' اس سلسلے میں۔" وہ کہتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ٹھیک ہے اوا! آپ کا حکم سر آنکھوں پر' میں کل ہی وکیل سے ملتا ہوں۔"

"شکر کرو' تمہارا بیٹا زندہ سلامت واپس مل گیا اور اس پر کسی قسم کا تشدد بھی نہیں کیا گیا ہے۔"

"جی اوا! اللہ سائیں کا احسان ہے مجھ پر۔" وہ انہیں

چھوڑنے دروازے تک آیا۔

"اچھا ادا اللہ وائی (نگہبان) دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

وہ جھک کر اعجاز نبی شاہ سے بغل گیر ہوا۔

"اللہ سائیں تمہیں آباد رکھے' سدا خوش رہو۔" اعجاز نبی شاہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا تھا۔

٭ ٭ ٭

کیس ختم ہونے کے بعد نور العارفین کو سفری دستاویز واپس مل گئی تھیں' اور وہ چھ ماہ بعد اس سے بغیر ملے چلا گیا' وہ کیسے ملتی اس سے' ان دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بند تھا' بلکہ پھپھو جان' شنزین وغیرہ بھی بہت کم آتیں' وہ بھی جیجی سے ملنے کے بہانے' مگر نور العارفین کی بے گناہ قید کے بعد ان کے گھرانے کا رویہ پھپھو آمنہ والوں کے ساتھ نرم ہو گیا تھا۔

شنزین نے اپنے سیل سے اس کے جانے سے اک دن پہلے بات کروائی تھی' مگر وہ صرف نم آنکھوں سے اس کو سنتی رہی۔ اس سے بات ہی نہ ہو سکی' اس کی کیفیت عجیب ہو گئی' جس دن وہ جا رہا تھا' اس دن وہ سارا دن بولائی بولائی چکرائی سی پھرتی رہی۔ وہ سب اس کو ایئرپورٹ سی آف کرنے گئے تھے۔

وہ اداسی سے باہر صحن میں نکل آئی' کھڑکی سے نالے کو ہٹا دیا گیا تھا' کتنی بے اختیاری کا مظاہرہ تھا اس کے وجود پر گو کہ بظاہر اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا' مگر نظروں کے کڑے پہرے اس کو بہت کچھ باور کراتے تھے۔

"سندھیا بیٹا! صحن میں نہیں جانا۔" کتنا نرم لہجہ ہوتا تھا' اس کی ماں کا' اور وہ صحن میں پاؤں نہیں دھرتی۔

"سندھیا رانی وحشی عنوان استعمال نہیں کرنا' تمہاری دوسری امی بہت چبھتی نظروں سے دیکھتی ہے مجھے۔" کتنی بے بس ہوتی تھی اس وقت ان کی آواز'

اور وہ فون کے قریب بھی نہ جاتی' اس کا اک اک قدم پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

وہ پریشان ہو کر جیجی کے پاس آئی تھی' جیجی نے اس کی حالت دیکھ کر بہت لمبی اور سرد آہ بھری تھی' سندھیا نے خاموشی سے سر ان کی گود میں رکھ دیا' ان کے چاروں طرف سکوت تھا' اور جیجی اس سکوت کا راز جانتی تھیں۔ وہ بہت پیار سے' چاؤ سے اس کے بالوں پر' سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔

وہ باہر آئی تھی۔

ہال نما برآمدے کے جھولے میں اس کی دوسری ماں امینہ سے بات کر رہی تھی۔

"بیٹے کی جدائی پر جیجی آمنہ بہت پریشان ہے' رو رہی ہے۔" امینہ اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

نغمہ نے طنزیہ نظروں سے سندھیا کو دیکھا۔

"ہاں ادی! آمنہ کا تو ہے بیٹا' مگر اس بھلے لڑکے کے لیے اور لوگ بھی پریشان ہیں' روتے ہی رہیں گے ساری عمر اس کے لیے۔"

اس کے طنزیہ اور استہزائیہ انداز پر وہ کٹ کے رہ گئی۔

بی بی عطیہ نے غور سے سوکن کو دیکھا۔ اور سندھیا کو یوں ڈائریکٹ نشانہ بنانے پر ان کو بے تحاشا غصہ آیا تھا۔

"اب شرفاء کا دور تو لد گیا' کنجریوں کا دور ہے' پیسہ بھی ان کے پاس' عزت بھی ان کے پاس' شہرت بھی ان کے پاس' شریفوں کے لیے تو بس رونا ہی ہے آج کل' حلال روٹی کے لیے ہی خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔" انہوں نے بہت دنوں بعد تاک کے اس پہ وار کیا تھا۔ نغمہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"ہاں ہاں ہم تو ہیں ہی ذلیل خوار' مگر شریفوں کے طور طریقے بھی اب بدل رہے ہیں' شہ دیتے دیتے لکڑی سے درخت بنا دیا بیٹی کو۔"

"ہاں بس کیا کریں۔" بی بی عطیہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "جب گھنگھرو اور ڈھولک حویلیوں میں در

آئیں' تو کچھ تو صحبت رنگ لائے گی نا' آج انہوں نے بیٹی کے دفاع میں سوکن کی زبان میں ہی بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

سندھیا نے حیرت سے ماں کو دیکھا تھا' پھر ماں کی سوکن کو' جو آج بی بی عطیہ کے اس طرح سے بات کرنے پہ دم بخود تھی۔

"تو سمجھانا تھا نا اپنی بیٹی کو۔" وہ تلملا گئی۔

"صحیح کہتے تھے بزرگ کے تخم تاثیر' صحبت کا اثر' مگر کیا کروں' انوار کے باپ نے کچھ بھی نہ سوچا۔"

بی بی عطیہ آج سارے جملوں کا حساب بے باق کرنے کے موڈ میں تھیں۔ سندھیا جو ہمیشہ ماں کو اس کے طنز پر شرم سے پانی پانی ہو کر صبر کے نہیں زہر کے گھونٹ بھرتے دیکھتی تھی۔ آج استعجاب سے ان کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھ رہی تھی' وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو کے میدان میں کود پڑی تھیں۔ اس کے دل کو بے تحاشا ڈھارس ملی تھی' یہ معرکہ ابھی چلنا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

٭ ٭ ٭

اس نے جب سے سنا تھا کہ چاچا حسن علی اس کی شادی کی تاریخ پکی کرنے آ رہے ہیں' اس کے آنسوؤں پر بندھا ہر بند ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی نمازیں پہلے سے لمبی ہو گئیں' اس کے تہجد بہت جلد رات کے پہلے حصے میں ہی شروع ہونے لگے' وہ یا مصلے پر ملتی' یا تسبیح پڑھتے یا روتے' اس نے دعا کو تقدیر کے ہاتھوں پہ دھر دیا تھا۔

اس نے پہلی بار جیجی کے سامنے زبان کھولی تھی۔

"جیجی! بابا جان سے کہیں' مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیں' مگر یوں زندہ درگور نہ کریں۔" اس نے روتے بلکتے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

"جیجی! آپ نے بھی تو شادی نہیں کی' ساری عمر ایک ہی نام پر بیٹھی رہ گئیں نا' مجھے بھی نہیں کرنی شادی۔"

بوڑھی جیجی کے سینے میں پڑے پرسکون دل میں ہلچل سی مچ گئی' وہ تو نکاح کے نام پر بیٹھی رہ گئی تھیں' اور ان کی آنکھوں میں خواب سجانے والا' سپنے رکھ کر گیا' تو تعبیر دینے کے لیے واپس نہ لوٹا' لندن میں کسی گوری کا اسیر ہو گیا۔ جیجی نے عمر گنوا دی اس کے نام پہ۔

جیجی نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اسے بھینچ کر سینے سے لگایا۔

"جیجی! میں شادی نہیں کروں گی' ساری عمر اسی چوکھٹ پہ بیٹھی رہوں گی' مگر بابا جان کو کہیں' مجھے سولی پہ نہ لٹکائیں۔"

جیجی آہستہ آہستہ اسے تھپکتی رہیں' آج ہی تو اعجاز نبی شاہ ان کو اطلاع دینے آئے تھے کہ حسن علی کل شادی کی تاریخ طے کرنے آ رہا ہے' اور انہوں نے کہا تھا۔ "نہیں اعجاز نبی شاہ! ابھی ٹھہر جاؤ' کچھ عرصہ اس کام کو ملتوی کر دو' بچی ابھی سنبھلی نہیں۔"

اعجاز نبی شاہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "جیجی! وہ میری بیٹی ہے' میرے فیصلے سے سر نہیں نکال سکتی۔"

"ہاں اعجاز نبی شاہ! وہ تمہاری ہی بیٹی ہے' تمہاری خامیاں اور خوبیاں اس کے اندر بھی موجود ہیں۔" جیجی نے دھیرے سے کہا۔ "اور شکر کرو کہ ابھی زبان نہیں کھولی' شمع کی طرح گھل رہی ہے۔"

اعجاز نبی شاہ خاموشی سے چند لمحے جیجی کو تکتے رہے' پھر اٹھ کر چلے گئے تھے۔ جیجی کے لہجے نے اسے بہت کچھ یاد دلا دیا تھا۔

اور آج سندھیا نے زبان کھول لی تھی۔

"صبر کرو' میرے بچے اللہ جو بھی کرے گا' بہتر ہی کرے گا۔"

تو می رات کو اٹھ کر اس نے وضو کیا اور تہجد پڑھنے لگی' اس کے رب سے راز و نیاز شروع ہو گئے تھے۔

٭ ٭ ٭

انہیں نیند نہیں آ رہی تھی' بار بار جیجی کا چبھتا ہوا لہجہ یاد آتا' "وہ تمہاری ہی بیٹی ہے' اعجاز نبی شاہ' کیا اس

کے اندر واقعی میری شدتیں آگئی ہیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، بظاہر وہ سو رہے تھے، نغمہ سے اس وقت وہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے، مگر وہ سوچ میں ڈوبے تھے۔

رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا، جب بجلی چلی گئی، اے سی بند ہو گیا تھا، وہ اٹھے کہ انوار نبی کو اٹھا دے کہ جنریٹر چلا دے، وہ سندھیا کے کمرے کے قریب ٹھہر گئے۔ اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ "وہ کس سے باتیں کر رہی ہے اس پہر؟" ان کا دل خوف سے کانپا، وہ بالکل دروازے سے لگ کر کھڑے ہوئے، رات کے سناٹے میں اس کی آواز بخوبی سنی جا سکتی تھی۔ شاید بے خودی میں اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

"یا اللہ! رحم کر مجھ پر، رحم کر۔" اس کی گھٹی گھٹی سی سسکیاں ابھریں۔ "اللہ سائیں! تو تو جانتا ہے نا میرے دل کی مرضی، میرے من کا بھید۔ میرا وجود تھک چکا ہے، اس زندگی کو گھسیٹتے گھسیٹتے تو مجھ پر رحم کر دے۔"

اور اللہ سے اس کے راز و نیاز سن کر اعجاز نبی شاہ لڑکھڑا گئے، ان کا سر چکرا گئے تھے، جیجی کے جملوں کی بازگشت بہت بڑھ گئی، وہ بھول گئے کہ وہ انوار نبی کو اٹھانے آئے تھے، وہ اس کے کمرے کے آگے سے گزر کے وہیں پڑے ہوئے جھولے میں بیٹھ گئے۔ اور اپنی محبت و جنون ان کے آگے آ کھڑا ہوا۔ یہ زیادہ دور کی بات تو نہیں تھی کہ ان کی یادداشت میں ماند پڑتی۔

وہ اپنے چچا زاد کی شادی میں گئے تھے اور لاویں دینے کی رسم میں ان کو اندر لے جایا گیا، وہ لاویں دے کر واپس جانے کے لیے پلٹے تھے کہ وہ ناچتی ہوئی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی، اس کا پھرتی سے لچکتا ہوا بدن گیت کے ایک ایک جملے کا عکس بنا ہوا تھا، اس نے خوبصورت مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی۔

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنے پیسے ان کے ہاتھ میں آئے، نکال کر اس کو دے دیے۔ لیکن وہ خالی سینہ لے کر لوٹے تھے، دل تو ان کا اس کے گھنگھروؤں میں اٹک گیا تھا۔

وہ ہالا کی مشہور گانے والی تھی۔ وہ محفل کی جان تھی، جب ناچتی تو نوٹوں کے ڈھیر لگ جاتے، گھنگھرو میں نہ جانے کتنے دل اٹکے رہ گئے تھے، مگر وہ آج تک کسی کے ساتھ اٹک نہ سکی۔

اس کا روپ اور اس پہ نخرے مردوں کے دل چھلنی ہو جاتے۔ وہ دوسری صبح اس کی چوکھٹ پہ جا بیٹھے۔

"سائیں! سنا ہے، تو تو بال بچوں والا ہے۔" ڈھولک بجانے والی موٹی سی مختیاراں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں ہوں، مگر اب نغمہ کو بھی اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔" اس نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر مدعا بیان کیا۔

وہ موٹی سی عورت جس نے اسے پالا تھا، طنزیہ ہنسنے لگی۔

"سائیں پہلے تو اس کے لیے نغمہ کی رضامندی ضروری ہے۔ پھر بعد میں ہماری بھی کچھ شر[ائط] ہوں گی۔"

"مجھے ہر شرط قبول ہے۔"

"دیکھیے سائیں! نغمہ کوئی کوٹھے کا ہیرا نہیں کہ جو جب اور جس وقت چاہے، اپنی انگوٹھی میں فٹ کر لے، اسے دلہن بنانا ہی چاہتے ہو، تو پھر وہ آپ کی حویلی کی زینت بنے گی۔ آپ کو اس کو وہی عزت دیں گے، جو کہ آپ کی شایانِ شان ہے۔" اس نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

"ہاں میں اسے اپنی حویلی لے جاؤں گا، تم بے فکر رہو۔"

وہ نغمہ کے ناز اٹھانے لگے، عنایات کی بارش کر دی۔ اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے، پیتے انہیں صرف وہ ہی نظر آتی تھی۔

اس نے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی شرط رکھ دی تھی، اور یہ پہلی شرط تھی جس کو ماننے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

"میرے دو بچے ہیں، وہ ان کی ماں ہے، میں چاہوں بھی تو اسے طلاق نہیں دے سکتا، کیونکہ جیجی مجھے چھوڑ سکتی ہے، مگر اپنی بھابھی کو نہیں، عطیہ اس کے ہاتھوں کی پلی ہے، چچا زاد ہے میری، اور میں اپنے خاندان پر یہ دھبہ نہیں لگا سکتا۔"

اس کی یہ شرط ختم کرنے کے لیے، اسے پچیس ایکڑ زمین لکھ دی تھی۔ ان کی شامیں نغمہ کی زلفوں کے سائے میں ہی گزرتیں۔

اب صرف جیجی کو راضی کرنا تھا۔ اور جیجی تو اس کے بارے میں چہ میگوئیاں سن کر پہلے ہی غصے سے بھری بیٹھی تھیں۔

"اعجاز نبی شاہ! ہماری سات پشتوں میں کوئی گانے والی نہیں آئی، اب اپنی نسلوں پر دھبہ لگاؤ گے۔"

"جیجی! میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں، مگر اسے نہیں۔" انہوں نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔

جیجی حیرت و استعجاب سے چند لمحے انہیں دیکھتی رہیں، مرد "اپنی" کرنی پہ آئے تو اس کے پاؤں کو کوئی زنجیر نہیں باندھ سکتی، انہیں لگا اعجاز نبی شاہ کو بھی اپنے اٹل ارادے سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ تب انہوں نے ناراض اور کمزور لہجے میں ان سے عطیہ کو منانے کو کہا۔

یہ ان کے لیے بڑا کام نہیں تھا، دوسرے دن وہ عطیہ کے لیے سونے کی آٹھ چوڑیاں لے آئے، اپنے ہاتھوں سے اسے پہنانے لگے۔

"دیکھو شادی تو مجھے کرنا ہی ہے، وہ تو میں اس سے کروں گا، پر تو بھی میرے بچوں کی ماں ہے، تیری حیثیت پہلے والی ہی رہے گی۔"

"سائیں! مرد کے دل کی دھڑکن اور عورتوں کی چوڑیوں کی چھن چھن، دونوں کا ردھم ایک ہی ہے، چوڑیاں ایک جگہ ٹکتی نہیں، مسلسل ڈولتی رہتی ہیں، آگے پیچھے۔ مرد کا دل بھی ایسا ہی ہے، ایک کو پا لینے کے بعد دوسری کی طلب شروع ہو جاتی ہے۔ مسلسل ڈولتا رہتا ہے، ایک جگہ نہیں ٹکتا۔" اس نے دکھ سے کہا۔

"اگلی فصل آئے تو تمہیں آٹھ اور بنا دوں گا۔" انہوں نے اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

اور پھر ان کی جنونی محبت رنگ لائی، اور نغمہ اپنے گھنگھروؤں سے ناتا توڑ کر ہمیشہ کے لیے ان کی حویلی آ گئی اور ان کے دل پر، گھر پر، اس کی حکمرانی پہلے دن کی طرح آج بھی قائم تھی، اس سے بھی ان کے اور بیٹے ہوئے تھے، انہوں نے ہمیشہ عطیہ کو نظر انداز کر کے نغمہ کی مانی تھی۔

مگر اب۔۔۔ اب سندھیا۔۔۔ کیا اس کے اندر بھی ان کی طرح اتنی شدید دیوانگی ہے۔

"وہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔" آواز کی بازگشت ان کے چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بجلی آ گئی تھی، مگر انہیں ساری رات نیند نہیں آئی، صبح کو بی بی عطیہ ان کے سامنے کھڑی تھیں۔

"سائیں! وہ میں چاہ رہی تھی کہ ابھی آپ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تاریخ طے نہ کریں۔" وہ اعجاز نبی شاہ کے بغور دیکھنے پر گڑبڑا گئیں۔

"تمہارے چاہنے سے کیا ہو گا۔ عطیہ بی بی! ہو گا تو وہی جو سائیں چاہے گا۔" نغمہ سائیں کا لفظ بڑے ناز سے ادا کر کے طنزیہ ہنسی۔

اعجاز نبی شاہ نے عطیہ کے متعلق پہلی بار اسے غصہ سے گھور کر دیکھا۔ آج تک وہ اسے محبت سے باندھتے آئے تھے۔

"کیوں چاہتی ہو ایسا؟" انہوں نے انہماک سے ناشتہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"وہ ابھی۔۔۔ مرتضیٰ، میرا مطلب ہے کہ بہت ہی غیر ذمہ دار ہے۔"

"اس عمر میں سارے ہی لڑکے غیر ذمہ دار ہوتے ہیں، ذمہ داری پڑے گی تو سدھر جائے گا۔"

"نہیں سائیں! نور العارفین بھی تو تھا، ساری ذمہ داری اپنے سر پہ لے لی، کوئی ایک کڑا دن دیکھنے نا دیا سب کو۔"

وہ بے ساختگی میں کہہ گئی تھیں، اور اب ان کی ڈانٹ کی منتظر تھیں، مگر خلافِ عادت وہ خاموشی سے ناشتہ کر کے باہر چلے گئے۔

شام کو حسن علی آیا تھا۔

"واہ! میں سوچ رہا ہوں، جمعہ کی شام کو یار دوست

بلوا کر اہتمام سے تاریخ طے کرنے آؤں۔"

"ابھی رک جاؤ۔ حسن علی! میں ذرا زمین پہ چلنے والے کیس سے جان چھڑالوں تو پھر اس معاملے کو دیکھوں گا۔"

"دا! وہ کیس تو سالوں سے چلتا آرہا ہے۔" حسن علی نے استعجاب سے کہا۔

"ہاں مگر اب جلد فیصلہ ہو جائے گا اس کا تب تک مہلت دے دو۔"

حسن علی ان کے حتمی انداز کو حیرت سے تکتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ واپس آگیا تھا۔ اس کے کفیل نے اس کی چھ ماہ کی غیر حاضری کی وجہ سے اور ملازم رکھ لیا تھا اس نے سات ماہ تک مختلف جگہ ملازمت کی مگر وہ کفیل اس کو اچھے نہیں لگے، تنخواہ کاٹ دیتے کام کی وجہ سے بہت سختی کرتے اس نے گھر گاڑی بیچ دی اور واپس لوٹ آیا ہمیشہ کے لیے۔

آتے ہی شوگر مل میں انچارج کی جاب اسے مل گئی تھی اور فارغ ٹائم میں اس نے زمینوں کی دیکھ بھال کا ذمہ لے لیا تھا۔

اس بار رشتہ مانگنے صرف پھپھو جان نہیں گھر کے سارے لوگ آئے تھے منت کرنے۔

"دا! آج میں آپ کے پاس نیانیوں (بیٹیوں) کا مان لے کر آئی ہوں، مجھے مایوس نہ لوٹانا۔"

اور اعجاز نبی شاہ نے نہ تو ہاں کی نہ "نا" بس سب کے سروں پہ ہاتھ رکھ کر خاموشی سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

یہ بہت بڑی تبدیلی تھی، جو سب نے محسوس کی تھی، پچھلی بار اس گھر سے انہیں کھلا انکار نہیں ہوا تھا، شہزین نے کمرے میں اس کے پاس آکر اسے خوشی سے بھینچ لیا تھا۔

"آج بابا سائیں کی زبان مرتضیٰ کے حق میں بند ہوئی ہے، ان شاء اللہ اب کھلے گی تو ہمارے حق میں۔"

"پتا نہیں اب تو دعاؤں پر سے اعتبار اٹھنے لگا ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"اچھا سنو بھائی تم سے ملنا چاہ رہا ہے۔"

"مگر کیسے؟" وہ ایک دم خوف زدہ ہوئی۔

"نکالیں گے کوئی راہ۔ بس تم تیار رہنا۔"

کچھ عرصے بعد یہ موقع ان کو مل گیا، جب مرتضیٰ تالا کھلوا کر بی بی آمنہ بھتیجی سے ملنے گئیں۔

شہزین اسے لینے آگئی۔ "بھائی کھڑا ہے کھڑکی پہ۔"

اور وہ چھپتی چھپاتی ڈرائنگ روم میں گھس گئی۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی بیچ والی دیوار کی کھڑکی سے دس بارہ فٹ دور تھی نور العارفین کھڑکی کے دوسری طرف اپنے صحن میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ جیسے ہی ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے نمودار ہوا، وہ بالکل کھڑکی کے قریب آگیا۔

"کیسی ہو؟" اس نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

وہ جو پہلے ہی گھبرا رہی تھی ایک دم خوف زدہ ہو کر منہ پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

اس نے بے بسی سے مضبوطی سے کھڑکی کے پٹ کو پکڑ لیا۔

وہ اس کے بے بسی سے منہ لٹکانے پر بے ساختہ ہنس دی۔ اس وقت اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کا دل اس کے سینے میں پوری رفتار سے بھی تیز دھڑک رہا تھا۔

اس نے چٹ لکھ کر لپیٹ کر گولا بنایا، سوچنے لگا کیسے پھینکوں، یہ تو ہوا میں اڑ جائے گی، آس پاس نظر دوڑائی تو نیچے مجبوری کی شکل پڑی تھی۔ اس نے فوراً اٹھا کر چٹ کے اندر رکھی کاغذ کو اس پر لپیٹ لیا، پھر احتیاط سے اس کی طرف پھینک دی، اس کا نشانہ صحیح تھا، سندھیا نے آرام سے کیچ کرلی۔

"کیسی ہے، میری سسی؟"

اس نے سر اثبات میں ہلا کر جواب دیا۔ وہ مطمئن نہیں ہوا، انگلی اور انگوٹھا ملا کر جواب لکھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے اسی چٹ کی پشت پر لکھا۔

"سسی کو اس کا پنوں نہیں مل رہا۔" اس نے وہ چٹ پڑھ کر لائٹر سے جلادی، اور جیب سے دوسرا کاغذ نکال کر لکھا۔

"پنوں ساری رکاوٹیں عبور کرکے آیا ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار اور حوصلہ بحال رکھنا۔"

پہلے والے عمل سے اس نے چٹ پھینک دی۔

"اور اس لمحۂ موجود میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی بات نہیں۔"

نور العارفین نے مسکرا کر جواب لکھا۔ "اور اس لمحۂ موجود میں تم سے زیادہ خوبصورت کچھ بھی نہیں، نہ یہ دنیا، نہ یہ زندگی۔"

سندھیا اس کی نظروں کی تپش اپنے چہرے پر بخوبی محسوس کر رہی تھی، الفاظ اس کے ذہن سے کاغذ پر منتقل ہو رہے تھے۔

محبت وہ کامل احساس ہے کہ ہر بدنصیبی کو خوش نصیبی، ہر زوال کو عروج ہر تاریکی کو روشنی میں بدل دیتا ہے، اور نور العارفین! تم وہ احساس، وہ محبت ہو جس نے مجھے زندگی سے متعارف کروایا۔"

اسے اور بھی لکھنا تھا، مگر چھوٹے سے کاغذ پر اور جگہ باقی نہیں تھی۔

اس نے چٹ لکھتے ہوئے، اس کے چہرے پر اترنے والے رنگوں کو بڑی محویت سے توجہ سے دیکھا تھا۔ وہ چٹ پڑھ کر سرشار ہو گیا، وہ روم بخود محویت سے اسے تکنے لگا، اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کھڑکی کے عین سامنے کھلنے والے گیٹ سے انوار نبی اور اس کے پیچھے داخل ہونے والے اعجاز نبی شاہ نے اس کو چٹ کی کوئی کیچ کرتے دیکھ لیا ہے، جب اس کو ہوش آیا تو انوار نبی عین اس کے سر پر پہنچ چکا تھا، وہ فوراً کھڑکی سے ہٹ گیا، اس چٹ کو جلانے کا اس کا ارادہ نہیں تھا، مگر اس وقت اس کو جلانے جتنی مہلت بھی اس کے پاس نہیں تھی، انوار نبی کا پاؤں کھڑکی کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ وہ اس کی طرف آرہا تھا۔ اس نے فوراً کھڑکی کی طرف پشت کی، اور سرعت سے چٹ کو منہ میں ڈالا، اس کے گلے میں کاغذ کے لپٹے ہوئے کونوں کی وجہ سے خراشیں آئیں، مگر جب تک انوار نبی کا ہاتھ اس کے گریبان پر پڑا وہ یہ ثبوت نگل چکا تھا۔

"خط کہاں ہے؟" وہ گرجا۔

"دا! کون سا خط؟ کیسا خط؟"

"میں اندھا نہیں ہوں، میں نے خود دیکھا ہے، تلاشی دو مجھے۔"

"آپ لے لیں، نکلے تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

انوار نبی نے اس کی مکمل تلاشی لی، جیبوں کی، جوتے اتروا کے دیکھا، ارد گرد ڈھونڈا، مگر کہیں سے وہ چٹ برآمد نہیں ہوئی۔

"بولو کہاں چھپایا ہے؟" اس نے اک زوردار تھپڑ مارا۔ اعجاز نبی شاہ حیرت اور صدمے سے گیٹ پر ہی کھڑے رہ گئے تھے، سندھیا تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے میں گھس گئی تھی اور انوار نبی دوسری طرف چیخ رہا تھا، سندھیا باپ کو دیکھ کر ٹھٹکی تھی، اور برآمدے میں کھڑی شہزین گھبرا کر فوراً بھتیجی کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"انوار نبی! چلاؤ نہیں، میری عزت کا معاملہ ہے۔"

انوار نے کھڑکی میں کھڑے افسردہ باپ کو دیکھا اور نور العارفین کا گریبان چھوڑ کر واپس پلٹا اور تھکے تھکے باپ کو سہارا دے کر برآمدے میں بٹھا لیا، سارے معاملے سے انجان بی بی آمنہ گھر جانے کے لیے بھتیجی کے کمرے سے نکلیں تو انہیں بے حال دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"دا! خیر ہے نا، طبیعت تو صحیح ہے آپ کی؟"

"بس پھپھو! بس، زیادہ انجان نہ بنیں۔" انوار نے تلخی سے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہتا، مگر اعجاز نبی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیرت سے ان کے بدلے ہوئے لہجے اور بے رخی پر دل برداشتہ واپس چلی گئیں۔

اور کتنے ہی دنوں وہ باپ اور بھائی کے سامنے نہیں آئی، نہ ہی انہوں نے کچھ کہا تھا اسے۔

"بابا جان کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟" وہ ان کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی، اور دل تھا کہ اپنی ہٹ پر ابھی تک قائم تھا، اس نے جی بھر کے

دل کو کو ساتھا جس نے اس کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

٭ ٭ ٭

"چیچی! میں بہت پریشان ہوں' عجیب سے دوراہے پر کھڑا ہو گیا ہوں' آپ بتائیں اب کیا کروں؟ اس سے زیادہ ذلت اٹھانے کا حوصلہ نہیں مجھ میں' ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں کہ نہ جانے اب آگے کیا ہونے والا ہے' کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔"

پہلے پہل وہ یہ بات سن کر ہی بھڑک اٹھے تھے' پھر ان کا انکار نرمی اختیار کر گیا' اس کے بعد انہوں نے خاموشی اختیار کر لی اور اب وہ دوراہے پر کھڑے کشمکش و پیچ میں پڑے ہوئے تھے۔

"تم کیا چاہتے ہو اعجاز نبی شاہ؟"

وہ چند ثانیے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ "چیچی! میں سندھیا پر کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو اعجاز نبی شاہ! ہو گا تو وہی نا جو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔" وہ چند لمحے انہیں تکتے رہے۔

"چیچی! ہمت نہیں ہار رہا خود میں۔"

"فیصلہ تو اس کے حق میں دو گے' جو تمہیں زیادہ عزیز ہو۔ اک طرف تمہارا بھانجا ہے۔ دوسری طرف بھتیجا اور بیچ میں سندھیا ہے۔ جو تمہیں ان دونوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اب زیادہ دیر کرنا مسائل کو بڑھانا ہے۔"

اس بار بی بی آمنہ لڑکیوں کو لے کر منت کرنے آئیں' تو جواب "ہاں" میں پا کر ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا تھا' شہزرین نے اسی وقت اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر سندھیا کو پہنائی تھی۔

یہ بات "آناً فاناً" پھیل گئی' شام تک زین ساری برادری میں مٹھائی بانٹ چکا تھا۔

اور رات کو حسن علی آ پہنچا۔

"ادا یہ... یہ میں کیا سن رہا ہوں' کیا یہ خبر صحیح ہے؟" اس نے رنج و غصے سے استفسار کیا۔

"مجھے معاف کر دینا حسن علی! میں جانتا ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مگر میں مجبور تھا۔" انہوں نے شرمندگی سے جھکے جھکے سے لہجے میں کہا۔

"ادا! زیادتی بھی زیادتیوں جیسی۔ بھلا ایک مجبوری تھی آپ کو کہ دس سالہ نسبت کا بھی خیال نہ کیا۔ کوئی قصور' کوئی جواز؟" وہ چیخ پڑا۔

اور اعجاز نبی شاہ کا سر جھک گیا۔

"میں بار بار آپ کے پاس آتا رہا کہ شادی کی تاریخ دیں' مگر آپ نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ادی آمنہ والوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ مگر آپ نے کہا کہ تم فکر نہ کرو' تمہارا پیسہ تمہارے ساتھ سچا نکلے گا۔ مگر نہیں ادا' میرا پیسہ ہی جھوٹا نکلا' میں ادی آمنہ کو کیا دوش دوں' جو کچھ بھی کیا' آپ نے کیا۔" وہ برآمدے کے بیچ کھڑا چیخ چلا رہا تھا۔

چیچی کے تسبیح کے دانے رک چکے تھے' وہ حسن علی کو تکے جا رہی تھیں' اور ہمیشہ سے سر اٹھا کر بات کرنے والے اعجاز نبی شاہ سر اٹھا نہیں پا رہے تھے۔

"بس کرو حسن علی! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

"چیچی آپ تو دھڑا (فریق) ہیں' ساری سازشوں میں شامل' اگر آپ ادی آمنہ کو شروع سے ہی منع کر دیتیں تو آج یہ نوبت نہیں آتی' آپ نے ہمیشہ ادی آمنہ کی اولاد کو میری اولاد سے زیادہ چاہا۔ آج کے بعد میرا آپ لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں۔" وہ دھاڑا۔

"حسن علی! نبی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے دور میں بھی کئی ایسے واقعات ہوئے' جن کے رشتے آتے' منظور یا نامنظور ہو جاتے' بات طے ہو جاتی' ٹوٹ جاتی' حتیٰ کہ نکاح تک ٹوٹ جاتے۔ پھر دوسری جگہ شادی ہو جاتی' مگر ان سارے فریقوں کے اندر رنجش کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ وہ کھلے دل و ذہن سے قبول کرتے' آپس میں جڑے رہتے' کیونکہ وہ خدا کی رضا پہ اپنی رضا قربان کر دیتے۔ تقدیر پر ان کا بہت گہرا یقین تھا اس لیے مقدر کا لکھا سمجھ کر وہ آپس میں قطع تعلق نہیں کرتے تھے۔ سو حسن علی! مجھے الزام نہ دو' اس کے مقدر میں لکھا ہی نور العارفین تھا۔ تو ہم اس کو

مرتضیٰ کے حوالے کیسے کرتے۔" انہوں نے بہت دھیمے سے رسانیت سے کہا۔

"بس کریں، جیجی! بس کریں۔ اپنی غلطیوں کو تقدیر کے تابع نہ کریں، آپ لوگ تو کل کی چھوکری کے آگے مجبور ہوگئے، میں بھائی تھا، مگر میرا خیال نہ کیا، اب مرجاؤں تو میرا منہ نہ دیکھنا، آج ہمارے سارے رشتے ختم ہوگئے۔" وہ کہہ کر تیزی سے ان کے گھر سے نکلا تھا۔

اعجاز نبی شاہ کو بہن کے طعنے پر غصہ تو بہت آیا، مگر ضبط کرگئے کہ انہیں اپنی زیادتی کا اندازہ تھا۔

☆ ☆ ☆

کائنات اس کی مٹھی میں تھی، دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں، اور معجزے رونما ہوجاتے ہیں، اور منزل اس کو یوں اچانک ملی کہ کتنے دنوں تک وہ یقین اور گمان کے بیچ ڈولتی رہی۔ اسے یقین بھی بھلا کیسے آتا، اس کے شب و روز خواب کے عالم میں گزر رہے تھے۔ اسے ڈر لگتا کہ کہیں یہ سپنا تو نہیں کہ بیدار ہوتے ہی ٹوٹ جائے۔

زندگی نے اپنا سارا حسن اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا، وہ اک اک لمحے سے خوشی کشید کررہی تھی۔ اتنی محبت، اتنی توجہ اس کا انگ انگ سرشار ہوجاتا، سب نے اسے ہاتھ کا چھالا بنا رکھا تھا، جب نورالعارفین اس کے سامنے ہوتا تو اسے لگتا کہ کائنات کی گردش تھم چکی ہے۔

نورالعارفین کے ملتے ہی وہ سب کو بھول گئی تھی، بیچ میں صرف ایک کڑی تھی۔ مگر میکے گئے اسے کئی دن گزر جاتے۔ وہ کمرہ آج تک اس کے نام تھا، وہ جاتی تو بھی جلدی جلدی جیجی اور اپنی ماں سے مل کے چلی آتی تھی۔ اپنے کمرے تک نہیں جاتی۔ اس کا باپ اکثر اس سے ملنے آتا، کھڑے کھڑے حال احوال پوچھتا، پھر چلا جاتا۔

اسے لگتا کہ بابا جان کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ ان کی بیٹی خط والے واقعے کے بعد اس سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتی، اور وہ اس کے پاس زیادہ دیر بیٹھ اسے زیادہ دیر تک شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا، بعض دفعہ اپنے باپ کی دوراندیشی و مصلحت پر رشک آتا اور اس کا دل باپ کی محبت سے پُر ہوجاتا۔

اس نے اس کے رشتے کا فیصلہ کرتے جیجی سے کہا تھا کہ "میں نہیں چاہتا کہ کل وہ دونوں جذبات میں آ کر غلط فیصلہ کر بیٹھیں، نورالعارفین ایک بار خودکشی کی کوشش کرچکا ہے۔ اور کل کو میری بیٹی ایسا کر بیٹھی تو پتا نہیں کیا ہو، بچے کہ نہیں، نورالعارفین کی خوش قسمتی کے بروقت زین کو پتا چل گیا تھا، اور یہ تو کمرہ بند کرکے بیٹھتی ہے، تو کھلوانا مشکل ہوجاتا ہے، جب تک دروازہ کھلتا نہیں، تب تک سولی پر لٹکا رہتا ہوں جیجی میں بیٹی کو گنوانا نہیں چاہتا، نا ہی بدنامی کا کوئی داغ اپنے سر پہ سجانا چاہتا ہوں۔"

اسے یاد آیا، وہ کس طرح نورالعارفین کی خودکشی کا سن کر تڑپی تھی، اسے لگا تھا کہ بس دنیا اب اس کے لیے ختم ہے۔ مگر جیجی اس کے کمرے میں آکر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ ان کی گود میں پڑی رہی تھی، رات تک نورالعارفین کے بچ جانے کی نوید اسے فون پر مل چکی تھی۔

"اف! اتنی دیر کردی آج اس نے۔" بھوک سے اس کا برا حال تھا، شام کے چھ بج رہے تھے "کئی بار آمنہ نے اس سے کہا۔

"بیٹا کھانا کھالو، بھٹائی کا میلہ ہے، وہ جانے کب آئے گا۔" اور وہ مسکرا کر "بس آتا ہی ہوگا" کہہ کر جان چھڑا آئی۔

"تو ہو بھابھی! ایسے چونچلے ہم نے بھی دو ماہ تک چلائے، مگر آگے کام نہیں چلا، بھئی مرد ہیں، دیر سویر ہوجاتی ہے، کون اتنی دیر بھوکا مرے، میں تو ویسے ہی بھوک کی کچی ہوں۔ اور آپ کو تو پانچ ماہ ہوگئے، بھئی میری مانو تو یہ تکلف اب چھوڑ ہی دو۔"

وہ دیورانی کی بات پہ ہنس پڑی۔ "فی الحال تو دل نہیں کررہا، آگے دیکھا جائے گا۔"

انتظار کرتے کرتے رات کے آٹھ بج چکے تھے، اور

سے اس کا سیل بھی آف تھا، بھوک کا احساس تو مٹ گیا تھا، اب صرف غصہ باقی تھا۔

صبح جاتے ہوئے وہ زیادہ سے زیادہ تین بجے تک کا کہہ گیا تھا۔ مگر اب وہ عشاء بھی پڑھ چکی تھی، وہ آیا تو تب تک اس کی ناراضی شدید ہوچکی تھی۔ وہ عین اس کے سامنے کہنی کے بل نیم دراز ہوگیا۔

"او ہو بھئی۔ یونیورسٹی کے دور کے دوست مل گئے تھے، ان کے ساتھ ادبی محفل میں اک مقالہ سنا۔ پھر وہاں سے اٹھے تو میں گھر آنا چاہ رہا تھا، مگر انہوں نے کہا نصرپور چلتے ہیں، چند دن پہلے اس کا میلہ ختم ہوا ہے، زبردستی لے گئے، نصرپور کے پیڑے لایا ہوں، تمہارے لیے، تمہیں پسند ہیں نا!"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میری شام و شفق جیسی سندھیا! اتنی ناراضی اچھی نہیں۔"

"فون نہیں کرسکتے تھے۔" اس نے منہ پھلایا۔ "یہ دیکھو" اس نے موبائل اسے پکڑایا، چارج ختم تھا۔

"تب بولو، کہاں سے فون کرتا۔"

"کسی دوست سے لے کر نہیں کرسکتے تھے۔"

"ارے بیوی! وہ تو پہلے ہی میرا ریکارڈ لگا کر بیٹھے تھے کہ شادی کے بعد تو شکل نہیں دکھاتا، ان سے سیل مانگ کر فون کرتا تو اپنی شامت لانے کے مترادف تھا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس نے شانوں سے پکڑ کر زبردستی اسے اپنی طرف پھیرا۔

لال لب لعلیں یمن جوں روئے رخ رشک چمن
نین نرگس، نیم خوابی، انتظار بے سبب

"انتظار بے سبب نہیں تھا۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"سوری یار! اب معاف کردو، آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔" اس نے خاموشی سے اس کی طرف سے منہ پھیرلیا۔

"اچھا جب ناراضی ختم ہوجائے گی نا تو پھر بتانا، میں آجاؤں گا۔"

وہ اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر کمرے سے نکل گیا، وہ چند لمحے بند دروازے کو تکتی رہی۔ پھر اپنی ہتھیلیوں کو مسلا جیسے اس کے لمس کو تازہ کررہی ہو۔ اب منانے کی باری اس کی تھی۔

وہ باہر نکل آئی۔ وہ صحن کے "نسبتاً" نیم اندھیرے گوشے میں، دوسری طرف منہ کرکے کھڑا تھا، وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ اور سر اٹھا کر چمکتے چاند کو دیکھا، اور شیخ ایاز کی اک بی غزل کا شعر اس کے لبوں پر ہمکنے لگا۔

چنڈ ریں کے پرچائے ڈے موں سال کھنش رٹھو
توں کئی چٹو موں ساریوں راتیوں کائی ننڈ کئی

(چاند پریں (محبوب) کو منا کردو! وہ مجھ سے کیوں روٹھا تم ہی کہو میں نے ساری راتیں کوئی نیند کی؟)

اس نے اپنے شانے پر رکھے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ وہ دونوں بے ساختہ ہنس دیے۔

☆ ☆ ☆

جیجی چلی گئیں، گلابی مسکاتے ہونٹوں، نرم پوروں والی جیجی چلی گئیں، چشمے کے پیچھے چمکتی آنکھیں بے نور ہوگئیں، ان کی سانسیں ٹھہر چکی تھیں، ان کہی باتیں سمجھنے، بھیدوں کو بغیر کھولے سمجھنے والی، اللہ کی یاد دلانے والی، جیجی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھیں۔

وہ حیران ساکت رہ گئی، یوں اچانک کیسے۔۔۔ کیسے ابھی شام کو تو وہ ان سے مل کے آئی تھی، انہیں ہلکا سا بخار تھا، اسے پتا چلا تو وہ ان کو دیکھنے گئی، وہ حسب معمول عصر کے بعد کی تسبیح پڑھ رہی تھیں، اسے دیکھ کر وہ حسب عادت مسکرائی تھیں، اس نے ان کی پیشانی کو چوما، پھر گردن پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جیجی! بخار ہوگیا کیا؟"

"بس بیٹا! ایسے ہی کچھ حرارت ہوگئی تھی، بوڑھا جسم ہے کچھ برداشت نہیں کرتا، تم بتاؤ، بیٹا کس کے پاس چھوڑ آئی ہو؟"

"جیجی! میں اس کو سلا رہی تھی کہ پھپھو جان نے

آپ کا بتایا' میں عین العارفین کو ان کو دے کر آئی ہوں کہ بس جیجی کو دیکھ کر جلد آئی ہوں۔"

"لے آئیں۔ میں دیکھتی کتنا بڑا ہوا ہے۔" جیجی ہنسی تھیں۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ارے جیجی جان! پانچ دن پہلے تو آپ نے دیکھا ہے' ابھی اتنا ہی ہے' ایک انچ بھی بڑا نہیں ہوا۔"

اس نے آرام سے جیجی کے پاؤں دبانے شروع کر دیے' وہ اور جیجی باتیں کرنے لگیں۔

"جیجی! آپ بالکل بوڑھی ہو گئی ہیں۔"

جیجی اس کی بات پر بے ساختہ مسکرا اٹھیں۔ جیسے کسی بچے کی بات پر مسکرایا جاتا ہے۔ اس نے بغور جیجی کے مسکراتے گلابی لبوں کو دیکھا۔

"بڑھاپا آسودہ کر دیتا ہے بیٹا! کسی بات کی فکر نہیں ہوتی' سوائے آخرت کے' پر اللہ بڑا رحیم و کریم ہے' اس کی رحمت کا آسرا ہے۔" چشمے کے پیچھے سے جیجی کی آنکھیں رحمت کے آسرے پہ چمکنے لگیں۔

بی بی عطیہ روتے ہوئے عین العارفین کو لے آئیں۔

"وہی آمنہ کھڑکی سے پکڑا کے گئی ہے' چپ نہیں کر رہا۔"

"مجھے پتا تھا کہ یہ ایک دم سے اٹھ جائے گا۔ مرغ جیسی نیند ہے اس کی' ادھر سویا' ادھر جاگا۔" جیجی اس کو مسکراتے' ضد کرتے دیکھتی رہیں۔

"جیجی! اس پہ دم کریں' بہت رونے لگا ہے۔"

"اس کو کبھی بھی اکیلا مت چھوڑنا' پیار سے سمجھانا' ضدی ماں' باپ کا بیٹا ضدی ہی ہو گا نا!" جیجی اس کے گالوں پہ پیار کر کے مسکراتی رہیں۔

"جیجی! ایسی دعا تو نہ کریں۔" وہ گھبرائی۔ "بس ابھی خصوصی دعا مانگیں' میرے بیٹے کے لیے کہ وہ نیک' صالح اور اچھا انسان بنے۔"

جیجی نے درود پڑھ کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

نور العارفین کے بلانے پر وہ واپس آئی تھی' اس نے چائے بنا کر اسے دی' جیجی کی طبیعت کا بتایا۔ وہ اسی وقت جیجی کے پاس گیا' پھر وہیں سے مغرب پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا' اور عشاء کے وقت جب وہ نماز پڑھ [illegible] تھی تو آمنہ کے رونے کی آواز آئی تھی۔

"جیجی گزر گئی ہے۔" اس نے جلدی سے سلام پھیرا اور رونے کی آواز پہ باہر نکلی' اسے چپل پہننے کا ہوش بھی نہ رہا تھا۔ وہ ان سب کے ساتھ وہاں پہنچی' اعجاز نبی شاہ' جیجی کے پائنتی کے نیچے بیٹھے رو رہے تھے۔ اس نے اپنے لب جیجی کی پیشانی پر رکھے' اس کے آنسو جیجی کے چہرے پہ گر رہے تھے' ان کے مسکراتے لب ساکت اور چمکتی آنکھیں بند تھیں' وہ رو رہی تھی' انھیں پکار رہی تھی۔ مگر وہ لب خاموش تھے' وہ زبان جس سے پھول جیسی باتیں نکلتی تھیں' وہ اب خاموش تھی' اس کو سمیٹنے والی گود اب نہیں رہی تھی۔

"فنا" مخلوق کا آخری ٹھکانا ہے' سندھیا دھی! انسان کی زندگی کا راز فنا میں مضمر ہے' بچپن فنا ہوتا ہے' تو لڑکپن آتا ہے' لڑکپن کے فنا کے بعد جوانی اور جوانی کی فنا کے بعد بڑھاپا' اور بڑھاپا موت کی پہلی سیڑھی ہے' بندہ بوڑھا ہو جائے تو موت کی طلب شدید ہو جاتی ہے' اور موت کی یاد بھی۔" وہ گلابی لب مسکائے' اور روشن آنکھوں میں نمی بھر آئی۔

اور اب موت کی طلب بھی فنا ہو گئی تھی' اس لیے کہ جیجی نے موت کو پا لیا تھا۔

"محبوب سے ملنے کی خاطر موت کا پل عبور کرنا پڑے گا۔ بغیر فنا کے محبوب نہیں ملتا بیٹا!"

وہ شدت سے رو رہی تھی' اور جیجی کے میٹھے سخن اس کے حافظے میں اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

"مگر جیجی! موت کے بعد ان بندوں کو خدا ملے گا؟"

"جو اس کے پیارے ہوں گے' جو اس کے دوست ہوں گے' وہ ہر ایک سے تو نہیں ملے گا۔"

"اس نے تو جگہ جگہ ہیرے جواہر بکھیرے ہیں' ہم ہی نہیں چنتے تو قصور تمہارا ہے نا بیٹا!" جیجی کا بوڑھا جھریوں بھرا چہرہ پر رونق ہو گیا۔

لوگ اس کے ارد گرد جمع ہوتے جا رہے تھے' مگر کسے کا ہوش نہیں تھا' اس کا بیٹا روئے جا رہا تھا' مگر ... جانے کے غم میں نڈھال تھی' اس سے وہ تنہا ... چھن چکی تھی جیسے یاروں سے بچھڑ کر وہ اچانک مسافر غریب الوطن ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

اس دن جیجی کے ایصالِ ثواب کے لیے خیرات تھی' وہ صبح سے ہی وہیں تھی۔

پوری برادری' حلقۂ احباب' حلقۂ ارادت' بہت سارے لوگ آ رہے تھے' کچھ دیر بیٹھ کر کھانا کھانے کے بعد جانے کے لیے اٹھ جاتے' وہ مختلف انتظامات میں لگی ہوئی تھی' باہر کس چیز کی ضرورت ہے' اندر کس کس نے کھانا کھا لیا' کون رہ گیا' ساری ذمہ داری اس نے اٹھائی ہوئی تھی۔

اعجاز نبی شاہ اور انوار نبی شاہ مختلف کاموں کے لیے ان کو بھیج رہے تھے۔

وہ چاچا حسن علی کی فیملی کے لیے کھانا لگوا کر باہر نکلی تو مرتضیٰ عین اس کے سامنے تھا۔

"سندھیا! اماں والوں کو بلاؤ' دیر ہو رہی ہے۔"

وہ اس کے یوں مسکرا کر دیدہ دلیری سے مخاطب کرنے پر بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔ تیزی سے پلٹی' نور العارفین برآمدے میں استادہ انھیں ہی دیکھ رہا تھا' اس کی خشمگیں نگاہوں سے بے طرح گھبرا گئی' ... والے گھورتا ہوا باہر نکل گیا تھا' وہ اندر اپنے کمرے میں آ بیٹھی' یہ کمرہ آج تک اسی کا تھا' باہر کیا ہو رہا تھا' کس طرح انتظام ہو رہا تھا' اسے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

صرف نور العارفین کی چبھتی نظریں اور مرتضیٰ کی مسکراہٹ اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ ... کی چھٹی حس اسے کچھ ہٹ کے ہونے کا سگنل دے رہی تھی۔

چاچا حسن علی کی فیملی پہلے دن سے مسلسل آ رہی تھی' مگر مرتضیٰ تو اس نے کسی کو مخاطب کیا تھا' نا ہی ان میں کسی نے اس سے بات کی تھی' مگر مرتضیٰ کی یہ ہمت ایک تو گھر میں گھس آیا' اوپر سے ہنس کر اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کی۔

وہ رات تک وہیں رہی' وہ نور العارفین کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی' مگر کب تک۔ رات کو وہ گھر آئی تو وہ غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔

"کیا بات چیت ہو رہی تھی مرتضیٰ سے؟"

اس نے اس کے تلخ لہجے پر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں' کہہ رہا تھا اماں والوں کو بلاؤ' دیر ہو رہی ہے۔"

"بس یہی کہا تھا اس نے؟ مسکراہٹ تو بڑی جاں نثاروں والی تھی۔" وہ بیڈ سے اٹھ کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"اب میں نے تو نہیں کہا تھا اسے مسکرانے کو' مجھے تو خود اس کی جرأت پہ حیرت ہوئی تھی۔"

"یہ جرأت بھی کسی نے اسے دلائی ہو گی؟"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" وہ اس کے طنزیہ لہجے کو نظر انداز کر کے رسانیت سے بولی۔

"میں انگاروں پر چل رہا ہوں' وہ روز آ رہا ہے' اس گھر میں جہاں تم بیٹھی ہوئی ہو' اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔" وہ چیخا۔

"جیجی کے ساتھ سب کا رشتہ تھا' اور ان کی وفات پہ ظاہر ہے سب آئیں گے' ہم کسی کو روک تو نہیں سکتے نا!" اس نے بڑی مشکل سے غصہ ضبط کیا تھا۔

"بڑی وکالت کر رہی ہو ان کی' افسوس ہو رہا ہے جیجی۔" اس نے چبھتے لہجے میں طنز کیا۔

اس نے غصہ ضبط کر کے اسے دیکھا' وہ اسے غصے سے گھور رہا تھا' اس نے کوئی جواب نہیں دیا' اور کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ وہ تیزی سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ جواب دو مجھے۔"

"کیا جواب دوں؟ کس بات کا؟"

"یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا ہے؟"

"کون سا سلسلہ؟" اسے واقعی کچھ سمجھ میں نہیں

www.paksociety.com

آیا۔

”مرتضیٰ سے کب سے مل رہی ہو؟“ اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ”کب سے چکر چلا رہی ہو اس سے؟“

اس کی برداشت جواب دے گئی۔ ”دماغ خراب ہوا ہے آپ کا“ میں کیوں ملوں گی مرتضیٰ سے‘ ایسی بات منہ سے نکالتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔“ وہ غصے سے چیخی۔

”کیسے کیسے یقین کرلوں میں تمہارا‘ بولو مجھ سے ملنے آسکتی ہو تو اس کے ساتھ ملاقات کے لیے نہیں جاسکتیں‘ سب کچھ سچ سچ بتاؤ مجھے‘ یہ پیغام رسانی کون کرتا ہے۔“ اس نے اس کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا‘ عجیب وحشت تھی اس کے لہجے میں۔

اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے‘ یہ اس کا نورالعارفین تو نہیں تھا‘ یہ تو پتا نہیں کون وحشی تھا؟ جو سر کے پیچھے سے اس کو بالوں سے پکڑے کھڑا تھا‘ حیرت دکھ اور تاسف سے وہ اس کو دیکھ رہی تھی۔

”اگر مجھے مرتضیٰ سے محبت ہوتی تو میں آج آپ کے گھر میں نہ ہوتی‘ یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس کی طرف متوجہ ہوگئی ہوں۔“ وہ اس کے ہاتھوں سے اپنے بال چھڑا کر سسک اٹھی۔

”پھر وہ کیوں تمہاری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا؟“ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”مجھے کیا پتا؟“ اس نے روتے ہوئے دبی دبی آواز میں کہا۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔“ اس کا ہاتھ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ اس کی انگلی کی انگوٹھی کا کونا اس کے نچلے ہونٹ کو چھو گیا تھا۔ اس نے گیلاہٹ پر ہونٹ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی انگلیاں سرخ ہوگئیں۔

”جو باپ کی دی ہوئی دس سالہ زبان کو ٹھکرا سکتی ہے‘ جسے باپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں‘ وہ میری عزت کی کیسے پاسبان ہوگی۔“

وہ عجیب وحشت میں گھر گئی۔ سب کچھ چکنا چور ہوگیا۔ سارے خواب کھوکھلے نکلے۔ سب کچھ راکھ ہوگیا۔ اس کا بیٹا بے بی کاٹ میں رو رہا تھا۔ [illegible] سے فوری طور پر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر جانے اس کلائی سے اس کی مضبوط جکڑ میں آگیا۔

”کہاں جارہی ہو؟ مجھے اور خوار کرنے۔“ بازو سے پکڑ کر اسے اندر کی طرف زور سے دھکا دیا۔ گری تھی‘ ٹیبل کے اوپر‘ اس کی آنکھ کے کونے کنپٹی سے خون بہنے لگا تھا۔

وہ اس کا خون دیکھ کر کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے لاک کرکے چابی اپنی جیب میں رکھی‘ قریب آکر اس کے دوپٹے کے کونے کو لپیٹ کر اس کی آنکھ کے نیچے زور سے دبایا‘ زین گھر میں نہ تھا۔ اس وقت وہ کسی کا بھی سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا‘ خود میں۔

وہ دراز میں کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگا‘ پایوڈین۔ اس کے زخم میں جیسے مرچیں بھر دی ہوں‘ اس نے جیسے تیسے بینڈیج کردی تھی۔

اس کا خون بند ہوگیا‘ وہ اسے وہیں چھوڑ کر خاموشی سے بیڈ پر جاکر لیٹ گیا‘ اس کا بیٹا روتے روتے تھک کر پھر سو گیا تھا۔ وہ نیچے کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی‘ کبھی اس کا ہجر اسے وحشت زدہ کردیتا تھا‘ مگر آج اس کی قربت اس کو وحشت زدہ کررہی تھی۔

اس نے اس شخص کو بے تحاشا چاہا تھا۔ اس کی محبت میں بے شمار طعنے سہے تھے‘ بے شمار راتیں اس کی یاد میں جاگ کر گزاری تھیں۔

”مسند حیا رانی! ابھی بندوں سے دل نہ لگانا‘ اگر تم نے بندوں کے بجائے اللہ سے دل لگایا ہوتا تو یہ نہ ہوتے۔“ جیجی کی دھیمی مدھر‘ مسحور کن سرگوشی ابھری۔

وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ اس کی روح کے زخموں کی چبھن اس سے زیادہ تھی۔

اس نے اس کی محبت پانے کے بعد جو طعنے باندھ لیے تھے‘ آج وہ سارے کھل گئے‘ جو زخم ہوئے تھے‘ وہ پھر درد کرنے لگے تھے۔

کیا پایا تھا اس نے‘ کچھ بھی نہیں‘ تہی داماں تھی‘ اس کے عشق کے رنگ بہت کچے نکلے‘ وہ جسے عشق سمجھ رہی تھی‘ وہ تو اک وقتی طلب تھی۔

”بندے کی بندے سے محبت کی بے تحاشا زیادتی‘ اور محبت کی بے حدی‘ دونوں ہی بندے کو غافل و تباہ کردیتی ہیں۔“

جیجی کے لب ہلے اور انگلیاں جیسے اس کے زخموں پر ٹھہر گئی تھیں۔ اس نے آنکھیں موند لیں‘ شدت درد سے اس کی ساری ریاضتیں دم توڑ رہی تھیں‘ وہ خود ٹوٹ رہی تھی۔ ان ہی رائیگاں ریاضتوں کے ساتھ ٹوٹ رہی تھی۔

کاش۔ کاش جو آنسو میں نے اس کی طلب میں بہائے تھے۔ اگر وہ آنسو اللہ کی طلب میں بہاتی تو ہر آنسو میرے گناہوں کا کفارہ بن جاتا۔

اگر وہ راتیں خالصتاً ”خدا کو یاد کرنے کے لیے جاگتی تو عرفان کی کئی منزلیں طے کرکے“ قرب الٰہی کی طرف بڑھ جاتی۔ مگر وہ نہیں سمجھی‘ وہ جیجی کی نصیحتوں کو ان کی عادت پر محمول کرتی رہی۔

وہ جان نہیں پائی کہ وہ تلقین‘ وہ نصیحتیں صرف اس کے لیے تھیں۔

✡ ✡ ✡

وہ بیڈ پر لیٹا اضطراب سے پاؤں ہلا رہا تھا۔

محبت اس کی ساری ترجیحات میں سب سے پہلی ترجیح تھی‘ پھر یہ ترجیح کیسے بدل گئی اور کب‘ کس وقت بدل گئی اس کو کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

وہ ایسی ہستی تھی‘ جس کا پنچھی اسے مل کر پھر کھو گیا تھا۔

اس نے نورالعارفین کو کھو دیا تھا‘ بے اعتباری کے بھنور میں اس کی محبت ڈوب رہی تھی۔

”ماں! ابھی بندوں سے لو نا لگانا۔“ اسے جیجی یاد آئیں‘ بے تحاشا یاد آئیں‘ اس کا دل چاہا‘ وہ ان کی گود میں سر رکھے اپنی تہی داماں کی داستان کہہ دے۔

وہ رو رہی تھی‘ سب کچھ کھو کر رو رہی تھی‘ اس نے ہجر بھی گنوایا اور وصل بھی۔

محبت نوحہ کناں تھی' اور اس کی رگ رگ میں شور بپا تھا' اس کا دل ماتم کر رہا تھا' کس سے ہوئی تھی اسے محبت اک شکی فطرت مرد سے' جو اس کو ساری عمر شک کی سولی پر لٹکائے بے اعتباری کے کوڑے لگائے گا۔

اس کے خالی دامن میں راکھ اڑ رہی تھی۔

وہ کیسے دنیا کا سامنا کرے گی' وہ جو محبت پا کر فاتح عالم بن بیٹھی تھی' اس شکست کو کیسے دنیا کے سامنے رکھے گی' اسے شرمندگی نے آگھیرا تھا۔

"بندے کا عشق کہیں نا کہیں انسان کو ضرور شرمندہ کرتا ہے بیٹا!" جیجی مسکاتے اس کے تصور میں آٹھہری۔ اس نے ڈرتے ڈرتے گھٹنوں سے سر اٹھا کے بیڈ پر سوئے ہوئے اس شکی مزاج کو دیکھا۔ جو اپنی بھڑاس نکالنے کے بعد سو رہا تھا' اور وہ ساری رات اسی کونے میں خالی دامن' خالی ہاتھ' خالی دل لیے جسم و روح پر لگے زخموں کو سہلاتی رہی تھی۔

فجر کے وقت اس کا سامنا سب سے پہلے جیجی آمنہ سے ہوا تھا۔ اور انسانی فطرت سے مجبور ہمدردی پا کر اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا' وہ اس کو لے کر سیدھی نور العارفین کے پاس آئیں۔

"تم کیا سمجھتے ہو' یہ کوئی بے یار و مددگار تمہیں ملی ہے' جس کو جب چاہو گے جوڑو گے' جب چاہو گے توڑو گے' نور العارفین! یہ کوئی گڑیا نہیں کہ کہیں بھی جائے تو خاموش بیٹھی رہے' زندہ سانس ہے" آخر میں غصے میں بولے گی" اک بات میری یاد کر لو کہ اب اگر تم نے اس پر شک کیا' یا ہاتھ اٹھایا' تو اس سے پہلے کہ ادا اعجاز نبی شاہ اسے خود لینے آئے' میں خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے معافی مانگ کر سندھیا کو اس کو سونپ آؤں گی۔"

وہ سر جھکا کر خاموشی سے سنتا رہا۔ ان کے غضب ناک غصے کے آگے اپنی صفائی میں اک حرف نہیں بول سکا۔

اس نے غیر متوقع طور پر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"مجھے۔۔۔ مجھے معاف کر دو' سندھیا! وعدہ۔ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔"

شکی مزاج مرد بزدل ہوتا ہے۔ حاصل کے بعد اس پر شک کرتا ہے' مارتا ہے' پیٹتا ہے' دے کر اپنی مردانگی پر خود ساختہ غیرت کی مہر ثبت کرتا ہے۔

اور جب اس محکوم کے چھن جانے کا خدشہ ہوتا ہے' تو اس کے آگے بیٹھ کر معافی مانگتا ہے' اس کے تلوے چاٹتا ہے' اس کی مردانگی اور بہادری محکوم کے چھن جانے کے خوف سے ہی زائل ہو جاتی ہے۔

اس کے تصور میں ماروی اور جیجی کی آخری ملاقات تازہ ہو گئی تھی۔

جیجی نے مدھم انداز میں مسکرا کر ماروی کو دیکھا پھر اس کی تائید کی۔

"بیٹا! حاکمیت چلتی ہی محکوم پر ہے' جو محکوم ہوں' تو پھر حاکمیت کیسی" تب اس نے ان کا یہ جملہ سرسری سنا تھا۔

"میں آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا' دیکھو مجھے معاف کر دو' خدا کے لیے' بابا اعجاز نبی کو یہ مت بتانا۔" وہ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

اس نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میں نے اسے قدموں میں بٹھانے کے لیے نہیں چاہا تھا۔"

اس وقت دل بالکل خالی تھا۔ اس کا مکین مکان خود ہی کھسک گیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔" وہ اس کے آگے دو زانو بیٹھا اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

اس کے دل میں کوئی ہلچل نہیں مچی' جیسے شاہ تاراج و محکوم شہروں میں کوئی ہلچل نہیں ہوتی۔

میں نے اسے چاہا' اسے خوب رونا آیا۔

اور اب ساری عمر اس شک کی چتا میں جلنا ہے۔

☆ ☆ ☆

ماروی نے جیجی کا اسلام آباد میں سنا تھا۔ لیکن...

تھا۔ سوشل آرگنائزرز کی ٹریننگ تھی' آخر میں ایک سیمینار اٹینڈ کرنا تھا۔ اس کو آتے ہوئے چند دن لگے تھے۔

"ہم جیسے لوگ بھلے جتنا بھی جئیں اس دنیا کو ان کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔" جواباً سندھیا کی طرف سے کہی سنائی دی تھیں اسے۔

اور آج اس کے چہرے کے داغ اور نیلوں نے اسے باور کرایا تھا کہ اس نے جیجی کے ساتھ بہت کچھ کھو دیا ہے' اس کے دل پہ عجیب سا بوجھ آ پڑا تھا۔ عشق اتنا شدید عشق' اور انجام اتنا کرب ناک۔

اس نے جیپ میں بیٹھ کر ڈرائیور کو کراڑ جھیل کے کنارے چلنے کو کہا۔ وہ وہاں آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بغور کراڑ کے پانی کو دیکھا' اور اس کے دل میں اک عجیب خواہش نے انگڑائی لی۔

وہ کراڑ سے "شاہ لطیف کے بیتوں کا حساب مانگے' دائیوں کو اس پانی میں تلاش کرے۔

"لوگ میرے کلام کا غلط مطلب و مفہوم نکالیں گے' میرا کلام ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

اور شاہ سائیں عبداللطیف بھٹائی ؒ نے اپنا سارا کلام کراڑ کے پانی کے سپرد کر دیا۔

"کیوں کیا شاہ سائیں نے ایسا؟" کراڑ کے پانی پر اس کی نگاہیں جم گئی تھیں۔

"جو کلام فقیروں اور شاہ کی اک ملازمہ کو یاد تھا' ہمیں تو وہی دستیاب ہے' آج "کاش شاہ سائیں کا وہ نایاب کلام مجھے مل جائے۔" کیسی عجیب انوکھی خواہش ابھری تھی' اس کے من میں۔ مگر یہ تو حسرت ہی رہے گی' اس نے بے ساختہ کراڑ کے پانی میں ہاتھ ڈالا' جیسے صدیوں پہلے ڈوبے ہوئے اوراق کو کھوج رہی ہو۔

اک اداس ملول کرنے والی شام کراڑ کے دوسرے کنارے کے پار اترتی جاتی تھی' اور اس کے اندر دکھ' اداسی گھیرا ڈالے اسے ملول کر رہے تھے۔

"اف! کیا ہو رہا ہے مجھے؟" اس نے سیٹی بجانے والے انداز میں لب سکوڑ کر سانس باہر نکالی تھی۔

آج کیوں بے سبب اداس ہے جی
عشق ہوتا تو کوئی بات بھی تھی

وہ زیر لب' یہ شعر پڑھ کر محظوظ ہوئی تھی' اس نے بھٹائی کی نگری سے واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ واپسی کا سفر ہمیشہ تھکا دینے والا ہوتا ہے' یہ کراڑ سے سندھو دریا تک کا سفر تھا۔ جام شورو میں دریا کی گود خالی تھی' وہ بانجھ ہو جاتا' پانی کے بغیر دریا بے فیض ہوتا ہے' اور محبت کے بغیر انسان۔

سندھیا شاہ کے جسم کے نیلوں کے بعد بھی عشق کا سفر جاری رہتا ہے' اس کے ذہن میں بہت سارے داغ' بہت سارے چہرے آئے تھے۔ محبت نہ رکنے والا سلسلہ ہے' انجام کا پتا ہو تب بھی ہو جاتی ہے' اس کے سامنے انسان بالکل مجبور ہے' وہ اسے اپنا لیتا ہے۔ عشق کا سفر جاری رہتا ہے' کیونکہ عشق تشنگی کا سفر ہے' اگر سیرابی ہو جائے تو یہ سفر رک جاتا ہے۔

اس سفر میں کچھ خود کو کھوج لیتے ہیں' کچھ خود کو کھو دیتے ہیں۔

پتا نہیں کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔

اس نے تھک کر سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائی' تب اس وقت ماروی ۔۔۔ کو پتا نہیں تھا کہ عشق کے بادشاہ نے اس کی خالی ہتھیلیوں میں بھی عشق دھر دیا تھا۔